ڈاکٹر شکیل پتافی
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج راجن پور

اُردو میں غالب شناسی کی روایت: ۱۹۴۷ء تک

Dr. Shakeel Petaafi
Department of Urdu, Govt.College Rajanpur

Tradition of Ghalib Studies in Urdu till 1947

The strong personality of Mirza Asadullah Khan Ghalib has influenced many generations. His superiority as a distinct prose writer and a universal poet has for long been acknowledged globally. The glittering tribute paid to him throughout the ages is quite evident. Whatever has been written on (Ghalib Comprehensibility) has become an everlasting topic thanks to this attempt. Ghalib's poetry and personality have always been a topic of discussion ever since his introduction to literary circles almost two centuries ago. In the article given below the history of Ghalib Comprehensibility has been brought under discussion. Different papers, discussions, thesis, articles and books have been analyzed to gauge Ghalib's poetic genius. The article illustrates how different poets, critics and literati have paid tribute to the poet from his age to the establishment of Pakistan.

ایک روایت کے مطابق میرؔ نے غالبؔ کا کلام سن کر کہا تھا:

> اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا(۱)

میرؔ کے اس بیان سے غالب شناسی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ غالب اُس وقت بارہ تیرہ سال کے تھے جب میرؔ نے

ان کے بارے میں یہ رائے اختیار کی تھی۔ غالبؔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے اور میرؔ کا سال وفات ۱۲۲۵ھ ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس کم عمری میں غالبؔ اتنے اچھے شعر کہنے کے قابل ہو گئے تھے کہ میرؔ جیسے بلند پایہ شاعر اور تذکرہ نگار نے اُن پر تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو؟ اس سوال کے جواب میں یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ غالبؔ فی الواقع کم عمری میں شعر کہنے لگ گئے تھے اور اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں ہی میں انہیں ایک شناخت مل گئی تھی۔ مولانا حالیؔ فرماتے ہیں:

> مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ انہوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ (۲)

غالبؔ کا اپنا بیان بھی دیکھئے:

دردہ سالگی آثار موزونی طبع پیدائی گرفت (۳)

غالبؔ کے بعض نامور محققین کا بیان بھی یہی ہے کہ انہوں نے کم عمری ہی میں شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں امتیاز علی خاں عرشی رقم طراز ہیں:

''وہ تقریباً دس برس کی عمر سے شعر گو تھے کیونکہ کلیات فارسی کا اظہار جو سب سے قدیم ہے یہی ثابت کرتا ہے''۔ (۴)

یہی بات مالک رام نے بھی کہی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> وہ مولوی محمد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ (۵)

ان بیانات کی روشنی میں یہ بات پایہء ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ غالب نے کم عمری میں شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا اور ان کی یہ آواز میرؔ کے کانوں تک پہنچ کر ان کی طرف سے ایک دوٹوک رائے کے اظہار کا باعث بن گئی تھی۔ میرؔ کی اس رائے کے بعد غالبؔ کا جامع تعارف ایک تقریظ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ تعارف نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کرایا ہے۔ ان کی نثری تقریظ غالب پر ایک تنقیدی نوٹ ہے جس میں انہوں نے غالب کو ''سرخیلِ انجمنِ نکتہ دان'' قرار دیا ہے اور ساتھ ہی چند فارسی اشعار بھی کہے ہیں جو کلامِ غالب پر باقاعدہ تنقیدی خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقریظ مع اشعار کئی صفحات پر مشتمل ہے جسے سرسید احمد خان نے اپنی تصنیف ''آثار الصنادید'' میں بھی شامل کیا ہے۔ (۶) اشعار کا نمونہ یہ ہے:

سخن را از خیالش ارجمندی
معانی را ز فکرش سربلندی
صریرِ خامہ اش بس دل پذیراست
بہشتی عندلیباں را صفیر است
جہاں را بے دریغ آموز گار است

گزیں معنی شناسِ روزگار است
بہ جولاں گاہِ معنی یکہ تازے
فلاطون فطرتے ' حکمت ترازے
زصہبائے سخن سرشار گشتہ
ورق از فکرِ او گلزار گشتہ(۷)

نواب ضیاءالدین احمد خان نیرخشاں کی یہ تقریظ دیوانِ غالب' اُردو کی پہلی اشاعت (۱۸۴۱ء) کے ساتھ شامل ہوئی۔اس وقت غالب کی عمر چوالیس برس تھی۔اُن کا اُردو دیوان پہلی بار سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان کے قائم کردہ مطبع ''سیدالمطابع'' دہلی سے شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔(۸)

اُس زمانے میں تذکرہ نگاری کا رواج عام تھا۔میؔر کے ''نکات الشعراء'' (۱۱۶۵ھ) کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے کئی تذکرے منصۂ شہود پر آ گئے تھے۔چنانچہ غالب شناسی کی اس روایت میں تذکرہ نگاروں کے اُن بیانات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جوانہوں نے غالب کے تعارف میں اپنے تذکروں کی زینت بنائے ہیں۔اس سلسلے میں خوب چند ذؔکا کا تذکرہ ''عیارالشعراء'' اولین حیثیت رکھتا ہے۔اشپرنگر کی مطابق یہ تذکرہ ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) اور ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) کے درمیانی عرصے میں تصنیف ہوا۔(۹) خوب چند ذؔکا اپنے اس تذکرے میں غالب کے متعلق لکھتے ہیں:

> مرزا اسداللہ خان غالب عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خاں عرف مرزا دولہ نبیرہ مرزا غلام حسین کمیدان ساکن بلدہ اکبرآباد شاگرد مولوی معظم شاعر فارسی و ہندی است از دست۔(۱۰)

''عیارالشعراء'' میں غالب کے جو اشعار بطور نمونہ درج ہیں ان میں سے چند بطور مثال یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

۱) گل کھلے' غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرِ خوش خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

۲) زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
اپنے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

۳) حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

۴) شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

۵) تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقاء میرے بعد

۶) باغ تجھ بن، گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیرِ چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے
۷) نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشہء ساعت کے کام آیا غبار اپنا(۱۱)

''عیارالشعراء'' میں تذکرہء غالب کے اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا اشعار میں آخری تین شعر (۵، ۶، ۷) نسخہء حمیدیہ کے سوا کسی اور دیوان میں شامل نہیں تھے البتہ بعد میں مولانا عرشی (۱۲) اور مالک رام (۱۳) نے اپنے اپنے مرتبہ نسخوں میں ان اشعار کو شامل کرلیا ہے۔

اسی طرح اعظم الدولہ سرور کے تذکرے ''عمدہ منتخبہ'' کا شمار بھی اس عہد کے معروف تذکروں میں ہوتا ہے۔ اس تذکرے کے آغاز واختتام کے سلسلے میں خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے :

> ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) یا ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) کو آغاز تالیف اور ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) کو اختتامِ تذکرہ کی تاریخ قرار دینا چاہئے۔ (۱۴)

''عمدہء منتخبہ'' میں اعظم الدولہ سرورؔ نے غالبؔ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> اسدؔ تخلص، اسداللہ خان نام، عرف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافہ اکبرآباد۔ جواں قابل و یارباش و دردمند امیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ.....اکثر اشعارش از زمینِ سنگلاخ مضامین نازک موزوں گشتہ زاویہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد دارد از نتائج مطبع اوست۔ (۱۵)

سرورؔ نے اپنے تذکرے میں مرزا غالب کے جو اشعار بطور نمونہ درج کئے ہیں اُن کی کل تعداد پینتالیس (۴۵) ہے جن میں پندرہ اشعار ایسے ہیں جو نسخہء عرشی اور نسخہء مالک رام کے سوا کسی اور مطبوعہء دیوان حتی کہ نسخہء حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ہیں۔ وہ پندرہ اشعار بطور نمونہ یہاں درج کئے جاتے ہیں:

۱) شمشیرِ صافِ یار جو زہر آب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو
۲) دیکھتا ہوں اُسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو
۳) ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے
۴) دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بے تاب ہے

دیدہء گریاں مرا فوّارہء سیماب ہے

۵) کھول کر دروازہء میخانہ بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

۶) مجلسِ شعلہ عذاراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہہ دامانِ صبا جاتا ہوں

۷) ہووے ہے جادہ رہ رشتہء گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

۱۰) پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

۱۱) نیاز عشق خرمن سوز اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

۱۲) جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

۱۳) یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ' غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط

۱۴) اسدؔ کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

۱۵) ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے(۱۶)

غالب شناسی کی روایت میں ''گلشنِ بے خار'' کا ذکر بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے۔نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا یہ تذکرہ اگرچہ ''عیارالشعراء'' اور ''عمدہ منتخبہ'' کے بعد کا ہے لیکن یہ تذکرہ اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے ذریعے پہلی بار یہ بات سامنے آئی کہ غالب نے اپنے بہت سے اشعار حذف کر کے موجودہ اُردو دیوان مرتب کیا تھا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری' نسخہء حمیدیہ کا سراغ سب سے پہلے شیفتہ نے دیا ہے۔(۱۷)

اس تذکرے کے آغاز و اختتام کے بارے میں شیفتہ نے لکھا ہے:

آغاز ۱۲۴۸ھ (جون ۱۸۳۲ء) میں شروع کیا اور آخرہ ۱۲۵۰ھ (اپریل ۱۸۳۵ء) میں دو سال کی کوشش کے بعد ختم کیا ہے۔(۱۸)

اپنے تذکرے میں غالب سے متعلق شیفتہ یوں لکھتے ہیں:

> غالبؔ تخلص، اسم شریفش نواب اسداللہ خاں، المشتہر بہ مرزا نوشہ از خاندان فخیم است و از روسائی قدیم، سابقہ مستقر الخلافت اکبرآباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود اکنوں دارالخلافہ شاہجہان آباد بدیں نسبت غیرت افزائے صفاہان و شیراز۔ طوطی بلند پرواز، چمن معانی است و بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی۔ پیش بلندی خیالش اوج فلک پستی زمین است و در جنب نہ نیشنی غورش، سرفرازی قارون کرسی نشین شاہین فکرش..... در اوائل بتقاضائے طبع دشوار پسند بہ طرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن می گفت و دقت آفرینی ہا میکرد آخر الامر از اں طریقہ اعراض کردہ اندازی.....غزلش چوں غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چو قصد یہ عرض دل پذیر.....دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات از اں منتخب گردید۔ (۱۹)

اس تعارف کے بعد شیفتہ نے چوراسی (۸۴) اشعار بطور نمونہ درج کیے ہیں۔ سب اشعار غالب کے متداول دیوان میں موجود ہیں۔ یہاں پہلا اور آخری شعر درج کیا جاتا ہے:

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے (۲۰)

اُس عہد کے تذکروں میں کریم الدین کا تذکرہ ''گلدستہء نازنیناں'' بھی قابلِ ذکر ہے۔ اپنے تذکرے کی تاریخ اختتام کے بارے میں کریم الدین نے تذکرے کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء میں اتمام ہوا اور ماہ صفر ۱۲۶۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع ہو گیا اور نام گلدستہء نازنیناں رکھا گیا۔ (۲۱)

اس تذکرے میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

> اسدتخلص، اسم ان کا نواب اسداللہ خاں بہادر معرفت بہ مرزا نوشہ خاندان فخیم اور روسائی قدیم اکبرآباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں.....سخن فہم و سخن داں اس پائے پر کہ متنبّی و کعب باوجود متنبا اور بلند پائیگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے، ان کے حضور، اشعار عاشقاں اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری۔ مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی اشک دہ عبارات ظہوری.....صاحبِ دیوان و تصانیف ہیں۔ مگر مدت سے فکرِ ریختہ گوئی زبان اُردو کو ترک کیا۔ مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصانیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا۔ اس سے چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کئے گئے۔ (۲۲)

یہ تذکرہ دو باتوں میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اوّل یہ کہ جتنا زیادہ نمونہء کلام اس تذکرے میں درج ہے اور کسی کے

حصے میں نہیں آیا۔ کریم الدین نے غالب کی بارہ غزلیں نقل کی ہیں جن میں اشعار کی تعداد سو سے تجاوز کر گئی ہے۔ دوم یہ کہ اس تذکرے کے ذریعے غالب کی ایک ایسی غزل کا سراغ ملا ہے جو ان کے کسی مطبوعہ دیوان حتیٰ کہ نسخہء حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ہے۔ وہ غزل یہ ہے:

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیاء مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں
شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں
اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریء دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں
دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمن جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں
میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہیں در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں (۲۳)

''گلدستہء نازنیناں'' کے حوالے سے اب غالب کی یہ غزل ''نسخہء عرشی'' (۲۴) اور ''نسخہء مالک رام'' (۲۵) میں شامل کر لی گئی ہے۔ علاوہ ازیں الٰہی بخش معروفؔ نے غالب کی اس غزل پر خمسہ کہا ہے جو اُن کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔ (۲۶)

غالب شناسی کی روایت میں یہاں قطب الدین باطنؔ کے تذکرے ''گلستان بےخزاں'' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس تذکرے کا تاریخی نام ''عندلیب'' ہے جس سے اس کا سال تصنیف ۱۲۲۴ھ نکلتا ہے۔ یہ اس کا سالِ آغاز ہے۔ اس کی تکمیل ۱۲۶۵ھ میں ہوئی۔ ''گلستانِ بےخزاں'' دراصل مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرے ''گلستانِ بےخار'' کے جواب میں یا یوں کہیے کہ ردِعمل میں لکھا گیا تھا۔ قطب الدین باطنؔ نے دیباچے میں شیفتہ پر اچھی خاصی تنقید کی ہے اور اُسے موردِ لعن وطعن گردانا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں باطنؔ کے اُستاد نظیر اکبرآبادی کے خلاف اس قسم کے کلمات لکھ دیئے تھے:

ان کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر جاری ہیں ان اشعار کی بنا پر نظیر شاعروں میں شمار ہونے کے لائق نہیں۔ (۲۷)

چنانچہ باطنؔ نے اپنے تذکرے میں انتقام لیتے ہوئے شیفتہؔ کو اس کے استاد سمیت برا بھلا کہا ہے۔ شیفتہ نے مومنؔ اور آزردہؔ کی تعریفیں کی تھیں۔ باطن نے دونوں کے کلام میں کیڑے نکالے ہیں۔ حتیٰ کہ اس حملے میں غالبؔ بھی طعن و تعریض کی زد سے محفوظ نہیں رہے۔ تاہم ''گلستان بے خزاں'' میں باطنؔ نے بطور نمونہ چودہ (۱۴) اشعار درج کئے ہیں جو غالب شناسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ غم خوار جانِ درد مند آیا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

بوئے گل، نالہء دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

اسدؔ! زندانیِ تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دست نوازش ہوگیا ہے طوقِ گردوں میں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

دام ہر موج میں ہے حلقہء صدکام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمئی بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (۲۸)

اسی طرح اس عہد کے بعض دوسرے تذکروں مثلاً ''بہار بے خزاں'' مئولفہ احمد حسن سحرؔ میں غالب کے احوال و

نمونہء کلام درج ہیں جن سے غالب کی بے مثل شخصیت کا اعتراف ہوتا دکھائی دیتا ہے جس سے غالب شناسی کی روایت آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔

''آثارالصنادید'' سرسید احمد خان کی معروف کتاب ہے جو ۱۸۴۶ء میں مکمل ہوئی اور اس سے اگلے سال ۱۸۴۷ء میں مطبع سیدالاخبار سے شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی۔ سرسید احمد خان نے اس کتاب میں غالبؔ کے لئے جو صفحات مختص کیے ہیں وہ غالب شناسی کا نادر نمونہ ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں جہاں غالب کا تعارف کرایا ہے وہاں ''دیوانِ غالب'' کے بارے میں ایک تنقیدی نوعیت کا جائزہ لیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب کلام غالب کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ وہ دیوانِ غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہاں ہاں! امید وبیم کی کیفیت دل میں لے کر میں کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا ہے بالیقین اُردو زبان کے اُس منتخب اُردو دیوان کے متعلق ہے' جو اعجاز مسیحائی رکھنے والی کلک کا پاکیزہ ترشح ہے اور اس قلم کو چلانے والا عقل کے لئے ترازوئے عدل ہے اور بصیرت کے لئے اصطرلاب ہے' جس سے وہ اجرام فلکی کے احکام معلوم کرتی ہے۔ اسے جوہر آئینہ آفرینش' معیار نقد گرانمائگی اور بلند پائیگی کے نردبان کا معراج کہیے تو بجا ہے۔ فی الواقعہ یہ شاعر گرامی منزلت قلمرو معنی پروری پر متصرف ہے' سخنوری کی ولایت کا فرماں رواں ہے۔ نوآئین نگاری کے جہاں کا مالک ہے۔ تازہ گفتاری کے جہان کا سالار' سخن گستری کے وجود کو حیاتِ نو بخشنے والا' دیدہ وری کی آنکھ کو بینائی بخشنے والا' جس کی وجہ سے قلم کی شان وشوکت بلند ہوئی اور دوات کے خانوادے کا چراغ روشن ہوا.....ان اوراق کے ایک ایک صفحہ کو وید مقدس پڑھنے والا برہمن سمجھے۔ اس کتاب کا ہر ورق ایک معبد ہے۔ ایک جہان نما آئینہ خانہ' ایک مصفّا مقام' جس میں مریم کردار پردہ نشین خیموں میں بیٹھے ہوئے ہیں اس میں ایسے شوخ چشم بھی ہیں جو شاید ان بازاری سے بھی زیادہ پردہ دری کرتے ہیں۔ (۲۹)

سرسید احمد خان کا غالب پر ایک اور مضمون بھی یہاں قابلِ ذکر ہے جسے سورج پبلشنگ بیورو (لاہور) نے اپنے جریدے ''سورج'' میں شائع کیا ہے۔ اپنے اس مضمون میں سرسید احمد خان نے غالب کے بارے میں لکھا ہے:

> ہمائے اوج مفاخر و معالی جاگزیں سدرۃ المنتہیٰ' مراتب بلند و مدارج عالی' موسس اساس شیوا بیانی بانی پائے الفاظ و معانی عندلیب بہارستان سخن گستری' طوطی شکرستان معنی پروری' اوج سمائے برتری ووالا تباری مہر سپہر بلند اختری وگردوں اقداری' شاگرد رحمان' استاد سحبان الممعی زبان نودعی بیان' فرزوق دہر ولبید آوان' سمی وصی رسول اللہ جناب مستطاب مرزا اسد اللہ غالب تخلص' دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش' زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانے میں خاموش' چراغِ انوری الٰہی کے شعلہ فکر سے روشن اور سینہء آرزی انہی کے آتش حسرت سے گلخن عنصری' اُن کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصرِ آتش سے متکون ہوا تھا۔ (۳۰)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے قبل جو تذکرے لکھے گئے ان میں شہزادہ قادر بخش صابرؔ کا تذکرہ ''گلستانِ سخن'' یہاں قابل ذکر ہے۔ یہ تذکرہ پہلی مرتبہ ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ غالب کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

> غالبؔ تخلص، شیر نیستاں سخنوری، ببر بیشۂ معنی پروری، یکہ تازِ عرصۂ کمال، یگانۂ کشورِ افضال، سیاح زمین سخن دانائے نوادرِ فن، زبدۂ کملائے جہاں، مرزا اسداللہ خان معروف بہ مرزا نوشہ سلمہ الرحمٰن، سخن سنج، بے مثل ونظیر اور صاحب دل پذیر ہے۔ خامۂ گوہر بار سے اقلیم سخن میں لوائے جہانگیری بلند کیا ہے اور یوسف معنی کو اس ہجوم بے تمیزی میں زلیخا منشانِ مصرِ سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے.....فکر اگرچہ حوصلۂ ہمت کے لائق جہد کرے، فضائے لامکان مرحلۂ مقصود کے روبرو دیدہ مور سے تنگ تر نظر آئے، خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جائے، خزانہ تحت العرش کو اس جائے گاہ رفیع سے گنج قارون سے پست تر ہو جائے۔ سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور شوخیٔ اشارات اور چستیٔ عبارات، گاہ اجمال کو رعایت سے آفتاب کو لباس ذرہ میں جلوہ دینا اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو ونما بخشنا.....ایک مختصر سا دیوان مرتب کیا اور مجموعۂ فارسی کا تو دیوان محشر سے بھی زیادہ اور پرغوغا اور ابیات بلند صدا سے مملو اور مشحون ہے۔ (۳۱)

۱۸۵۷ء جنگ آزادی کا سال ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی کی یہ تحریک محض فوجی بغاوت تک محدود نہیں تھی بلکہ اس سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس معاشرتی ابتری میں علم و فن کے میدان میں رکاوٹیں حائل ہوگئیں۔ اہل علم تصنیف وتالیف کا کام جس انہماک سے کر رہے تھے اس میں تعطل واقع ہوگیا اور لوگوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی کے مطابق:

> ۱۸۵۷ء کے بعد کئی برس تک انگریزوں کی حکمت عملی اسی اصول پر مبنی رہی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کمزور، ناکارہ اور محتاج بنا دیا جائے اور ان کے حوصلے ایسے پست کر دیئے جائیں کہ وہ پھر کبھی انگریزی حکومت کے خلاف نبرد آزما ہونے کا خیال تک دل میں نہ لاسکیں۔ جنگِ آزادی کا پہلا مرکز دہلی تھا اور سب سے زیادہ مصیبت بھی دہلی ہی کے حصے میں آئی۔ (۳۲)

غالبؔ دہلی میں رہتے تھے اس لیے وہ بھی جنگِ آزادی کی مصیبت سے بری طرح متاثر ہوئے۔ انگریزوں کی مسلم دشمنی اور ہندو نواز پالیسی نے علم وادب کی روایات کو پھلنے پھولنے نہیں دیا۔ جس کے نتیجے میں کم وبیش دس سال تک کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آسکی۔ البتہ ۱۸۶۲ء کے ''اودھ اخبار'' میں غالب کا ذکر ملتا ہے۔ لکھنو کا یہ اخبار شمالی ہند کا ایک اہم اخبار تھا۔ منشی نول کشور اس اخبار کے مالک تھے۔ وہ صاحبِ اخبار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مطبع کے بھی مالک تھے۔ جو بلاشبہ پورے ہندوستان کا ایک بہت بڑا مطبع تھا۔ اس اعتبار سے منشی نول کشور اس دور میں عربی، فارسی اور اُردو کے سب سے بڑے ناشر بھی تھے۔ مرزا غالبؔ نے جب ان سے تعلقات پیدا کیے تو وہ غالبؔ کے بھی ناشر بن گئے۔ اس تعلق کا آغاز ۱۸۶۰ء میں ہوا۔ جبکہ غالب کے خطوط میں ''اودھ اخبار'' کا پہلا ذکر ۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں ملتا ہے، جو شیر نرائن

آرام کے نام لکھا گیا تھا۔ لکھتے ہیں:

اودھ اخبار' بھائی ضیاءالدین احمد کے یہاں آتا ہے اور وہ میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ (۳۳)

۱۸۶۲ء کے ''اودھ اخبار'' کے مختلف شماروں میں جہاں غالب کا ذکر آیا ہے' ان میں یکم جنوری ۱۸۶۲ء سے ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۲ء تک کے شمارے شامل ہیں۔ ان شماروں میں غالب کی تصانیف کے اشتہاروں کے علاوہ غالب سے متعلق ایک خبر بھی ہے اور ان کا ایک نثری مضمون بھی شامل ہے۔ مضمون کے بارے میں محمد عتیق صدیقی کا کہنا ہے:

اس مضمون کی اہمیت یہ ہے کہ یہ سیاسی نوعیت کا ہے اور میرے علم کے مطابق مرزا غالب کے اردو نثر کے کسی متداول مجموعے میں اسے جگہ نہیں مل سکی ہے۔ (۳۴)

''اودھ اخبار'' کے شماروں میں جہاں غالب کا ذکر آیا ہے' یہاں ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کے ''اودھ اخبار'' میں شائع ہونے والے ایک اشتہار کا متن یہ ہے:

''اک بشارت نئی سنو ہم سے
گوہرِ آب دار لو ہم سے

ایسا مژدہ سناتے ہیں کہ کسی نے سنا نہیں وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں۔ مرحبا کہیے' شاہد شریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو یوسف سرِ بازار آتا ہے۔ عزیز ہر دل ہے' دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دوچار ہوں گے۔ نقد تمنا سے خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھایئے' اب نقاب چہرہ سخن سے اٹھایئے۔ آوارہ گوشِ جہاں' نزدیک دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ خان صاحب غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دل آرام رنگین ادا کا عنقریب شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فرد کمال ہے عالی مضامین قصائد لاجواب رنگین غزلیں انتخاب کہ انہیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جایئے۔ نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لایئے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں' سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے اربع عناصر کہیے۔ آب دار قطعات کو قطعات جواہر کہیے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے' ہر بیت شاید ماہ سیمائے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں کہ سب سلک گوہرِ شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانہ کا ہاتھ آیا' جس کو نواب ضیاءالدین خان صاحب بہادر دہلوی نے جدوجہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں۔ آفتاب کی صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو اس کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سبحان ثانی ہیں' جو اَب انوری اور خاقانی ہیں۔ ہر نقطہ ان کے قلم کا اختر اوج کمال ہے جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں' موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تقریباً چالیس جز میں چھپے گی۔ بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے (تین روپے چار آنے) کو پائیں

گے۔چھپ چکنے کے بعد پورے (پانچ روپے) مقرر ہو جائیں گے۔ غالبًا اہل ہنر سنتے ہی اہتراز میں آئیں گے چھپنے تو دو ٔ ہاتھوں ہاتھ اُٹھالے جائیں گے۔اشتہار دینے کا یہ سبب ہے' صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یک سر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مدِ نظر رہے گا۔اگر ابھی سے طلب گار رہوں' کمی قیمت کے حصہ دار ہوں۔ (۳۵)

محولہ بالا اشتہار گویا کہ غالب کی شخصیت اور فن پر ایک مدحیہ تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔اسی طرح ۸رجنوری ۱۸۶۲ء کے شمارے میں غالب کی تصنیف ''قاطع برہان'' کا اشتہار شائع ہوا۔ بعدازاں یہی اشتہار ۲۶رمارچ' ۲راپریل اور ۹راپریل کے اخبارات میں بھی شائع ہوتا رہا۔قاطع برہان کا اشہتار فارسی زبان میں تھا جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

ارباب فرہنگ و ہنر را مژدہ باد و نوید بگوش نکتہ سنجاں رساد کہ گو ہر لفظ آب تازہ دیدہ وفرائد معنی مجلائے نور سیدہ' اعلیٰ نقاد جو ہر تحقیق' روشنگر آئینہ تدقیق' آموزگار جلیل المناقب نواب اسد اللہ خان غالب کہ مشاطۂ قلمش در زلف وخال ارائی سخن بے نظیر ست ورنگینیِ طبعش غازہ روئے شاہداں دلپذیر برہان از تمام کتاب چیدہ ہنجار استقامت وانمودہ وجا بائیکہ رہوارش سکندری خوردہ عنان آگہی برستارہ سودہ' حاصل کہ زلاتش برآوردہ باصلاح پرداخت وہمہ راجمع نمودہ رسالہ مختصر ساخت ....طبع ایں کتاب کہ از دہ جز بیش نباشد قریب اختتام رسیدہ یقین کہ در دو ہفتہ تیار گردد و قابل تماشائے اولی الابصار گردد............ رعایت سبق برندگان مدِ نظر شدا یں زماں یک روپیہ قیمتش مقرر شد۔ (۳۶)

''کلیاتِ فارسی'' اور ''قاطع برہان'' کے اشتہاروں کے بعد مرزا غالب سے متعلق ایک خبر بھی ''اودھ اخبار'' میں شائع ہوئی۔خبر مختصر ہے لیکن تمہید پورے ایک صفحے پر مشتمل ہے۔بہر حال اس خبر اور تمہید سے غالب شناسی کی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔دیکھیے:

نواب مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی

سب جانتے ہیں کچھ حاجت دلیل نہیں کہ آج ہندوستان میں ان کا کوئی عدیل نہیں۔فصاحت و بلاغت میں سحبان ثانی ہیں فنِ شعر میں جواب انوری وخاقانی ہیں۔زمینِ سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ہر نقطے کو اختر اوج معانی بنایا۔زور فکر ان کا جہاں میں مشہور ہے نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔جناب جہانیاں مآب ملک معظّمہ ہند وانگلینڈ کی مداحی میں وہ پایہ بلند ومرتبہ ارجمند پایا کہ ابتدائے عمل داری سرکاری سے کسی ہندوستانی کے لئے اس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود دیکھی ہے اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے۔آگے ایک قصیدہ ملکہ معظّمہ کی شان میں کہا تھا۔وہاں تو ہر کمال کی قدر دانی ہے۔کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے۔جب فیض یاب سماعت ہوا' منظور نگاہ مرحمت ہوا جود ونوال کی طرف ہمت آئی صلہ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی۔ولایت سے ڈاک میں پہنچ کر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر

تجویز ہے عنقریب حظ اٹھاؤ گے بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ اس کی اطلاع پاؤ گے۔ (۳۷)

محولہ بالا خبر ''اودھ اخبار'' ۳؍جون ۱۸۶۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی قبل اس کے ۲۵؍مارچ ۱۸۶۳ء کے شمارے میں ایک اور خبر شائع ہوئی جس سے انگریز حکام کے ہاں غالب کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ خبر کچھ اس طرح سے ہے:

قدر دانی حکام..... بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں' اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں۔ دیکھیے ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی' کمال کی قدر دانی کی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کر کے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا۔ (۳۸)

اسی طرح ''اودھ اخبار'' کے صفحات میں ''ہندوستان کی سمجھ'' کے عنوان سے مرزا غالب کا ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون زیادہ تر سیاسی نوعیت کا ہے جس میں جنگِ آزادی کے بعد کے ملکی حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے' اور انگریز سرکار کے ساتھ وفاداری اور حکام کی مہربانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مضمون سے پہلے منشی نول کشور (مدیر اخبار) کی طرف سے ایک تعارف کرایا گیا ہے جو غالب شناسی کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھا ہے:

آج کل دانائے روزگار رسا آمد اول الابصار' ارسطو فطرت' فلاطون فطنت' جناب والا شان' عالی مناقب' مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے جن کی سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے' استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے' نافہموں کی فہمایش میں ایک نثر تحریر فرمائی ہے۔ ہمارے مضمون خیالی سے توارد ہوا ایسی تقریر فرمائی ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں' اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی پیش کش ناظرین مشتاق ہوا کریں گی۔ (۳۹)

غالب کا مضمون یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اس مضمون پر ایک تبصرہ ''اودھ اخبار'' میں شائع ہوا تھا۔ یہ تبصرہ غالبؔ کے ایک شاگرد' مردان علی خاں رعناؔ کی طرف سے ایڈیٹر اخبار کے نام ایک مراسلہ کی صورت میں تھا۔ جسے ۲۰؍مئی ۱۸۶۲ء کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ یہ مراسلہ ''خیال خیر ما آل انما'' کے عنوان سے ملتا ہے جو اخبار کے تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مراسلے کے ضروری اقتباسات یہ ہیں:

آپ کے اخبار حق نگار میں عبارت نثر ریختہ قلم جواہر رقم استاذی جناب والا مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی دام افضالہم کی در باب تہدید و تنبیہہ عوام و کج فہمان ہند میری نظر سے گزری..... از آن جا کہ تحریر جناب ممدوح و مافی الضمیر کو میں بھی حتی الوسیع بسیط کرنا سعادت جان کر واسطے مزید تنبیہہ ہر خاص و عام عرض کر کر عارض ہوں کہ آپ بوسیلہء اندراجِ اخبار گوہر بار خود بندگانِ خدا کو اس سے متنبہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمایئے گا..... بہ تصدیق قول حضرت غالب کے یہ بات ظاہر کی جاتی ہے کہ فی الواقع ہر شہر میں از روز شہرت جنگ ایرانیاں و افغانیاں جو دو سہ ماہ سے ان کے درمیان ہے طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکائے جاتے ہیں۔ مگر کاٹھ کی ہانڈی میں۔ چنانچہ از کلکتہ تا لکھنؤ بندہ سنتا چلا آتا

ہے اور اس طرف حضرت غالب نے سنی جس کے دفعیے میں حضرت ممدوح نے تنبیہہ خیر خواہانہ نوک ریز خامہ حق شامہ فرمائی ہے اور لکھنو کے جوڑ توڑ تو مشہور ہیں۔ جب حضرات افیون خور اور مدک نوش ہوائے نشاۃ کذا میں سر بہ فلک ہوتے ہیں پھر وہ ان کو دور کی سوجھتی ہے کہ فرشتہ خاں کا ادراک بھی وہاں تک نہیں پہنچتا..... میں نے راہ چلتے یہاں تک سنا کہ شہر کی عمارتِ شکستہ کی جو ہمواری ہوتی ہے یہ سامانِ جنگ کیا جاتا ہے اور اگلے چاند یعنی ذالحجہ میں شہر پھر لٹے گا..... ایسی افواہیں ہند کے ہر دیار و امصار میں صبح سے شام تک ہزار اڑتی رہتی ہیں۔ (۴۰)

اُردو اخبارات کے ساتھ ساتھ اس عہد کے انگریزی اخباروں میں بھی غالب کا ذکر ملتا ہے۔ دہلی کا ایک معروف انگریزی اخبار "MOFUSSILITE" (مفصلائٹ) تھا۔ جس کے ایک شمارے میں IXION (اکسیون) نامی ایک شخص کا خط شائع ہوا تھا جو غالب شناسی کی ایک زندہ مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں دہلی سے ایک انگریزی اخبار مفصلائٹ کے نام سے نکلتا تھا جس میں غالب کے اس مقدمے کے متعلق ایک خط ۱۲/ مارچ ۱۸۶۸ء کو چھپا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی ضیاء الدین مدعا علیہ کی طرف سے شہادت کے لئے پیش ہوئے تو کسی نے مجسٹریٹ کے کان میں کہہ دیا کہ یہ بڑے معزز اور عالم ہیں گواہی لیتے وقت انہیں کرسی دی جائے۔ مجسٹریٹ نے قاعدے اور دستور کے خلاف مولوی صاحب کے لئے کرسی کا انتظام کر دیا..... مکتوب نگار لکھتا ہے: میں سخت حیران ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر نے مولوی ضیاء الدین کو کس بنا پر کرسی دی؟ اس رعایت سے غالب کے ساتھ سخت بے انصافی ہوئی ہے۔ وہ سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں۔ لیفٹنٹ گورنر کے دربار میں انہیں مولوی ضیاء الدین سے اونچے درجے پر بٹھایا گیا ہے۔ (۴۱)

مفصلائٹ میں شائع ہونے والے انگریزی خط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں جس میں مرزا غالب کے مقام و مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔ واضح رہے یہ خط "CORRESPONDENCE" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

> Dear Sir,
>
> You have, I observe, in your issue of the 30th instant taken notice of the libel case now under inquiry befor the Assistant Commissioner, Dehli, in which Mirza Asudullah Khan alias Mirza Nausha Ghalib, the most celebrated persion scholar and poet laureate or India, is plaintiff..... (He) holds a very respectable position in society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieuftenant Governor of the Punjab and took precedence of the gentleman to whom such

marked favour has been shown, and although not a very good perssioan,scholar,he is in every other respect desering of greater consideration.(۴۲)

اس عہد کے دیگر اخبارات میں غالبؔ سے متعلق جو جو خبریں شائع ہوئیں وہ غالب کی شہرت اور غالب شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ان میں سے چند اخبارات کی متفرق خبروں کے اقتباس درج ذیل ہیں۔

ا۔''اسعد الاخبار''(آگرہ)۱۵رجولائی ۱۸۵۰ء

ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلٰی القاب مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کو بہ فرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر، جو تیموریہ کے زمانے سے سلطنتِ حال تک ہو، مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آئندہ انواع پرورش کا متوقع کیا۔اور نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔یقین ہے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متین عبارت میں لکھی جائے گی کہ ہر ایک اس کے لطفِ عبارت سے فیض یاب ہوگا۔(۴۳)

۲۔''شعلہ طور''(کانپور)۱۰را کتوبر ۱۸۶۵ء

دہلی۔مرزا نوشہ صاحب نے درخواست پرورش بنا بر سبیل ولایت بحضور صاحب کمشنر پیش کی تھی۔بدیں حکم واپس، کہ پیش گاہ ملکہ ءمعظّمہ سلطنت ہائے سے کچھ پرورش نہ ہوگی۔(۴۴)

۳۔''خیر خواہ پنجاب''(لاہور)۱۹رجنوری ۱۸۶۶ء

طوطی ہند نواب مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ خاں غالب مع الخیر رام سے داخل دہلی ہوئے۔(۴۵)

غالب اپنے عہد کے تقریباً تمام اخبارات کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔انہوں نے چند اخبارات پر تبصرے بھی کیے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ صحافت میں اعلیٰ قدروں کے قائل تھے وہ اپنے احباب کو اخبارات پڑھنے کی ترغیب بھی دیتے تھے اور ان کا خریدار بنانے کی خصوصی کوشش بھی کیا کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اخبارات غالب کے حق میں سینہ سپر رہے۔لیکن ایک نقصان بھی ہوا کہ ان کے حریف اخبارات غالب کی مخالفت پر اتر آئے۔مثلاً''سید الاخبار''(دہلی) کی حمایت نے''دہلی اردو اخبار''کو ان کا دشمن بنا دیا اور''آئینہ سکندر''(کلکتہ) کی تعریف نے''مہر منیر''(کلکتہ) کو مخالف بنا دیا۔

مذکورہ اخبارات کے علاوہ انہوں نے جن اخبارات کو پڑھا اور ان پر تبصرے کیے ان میں''جام جہاں نما''(کلکتہ) دبدبہ ءسکندری (رام پور)، آئینہ سکندر (کلکتہ)، اشرف الاخبار (دہلی)، بوستانِ خیال (دہلی)، زبدۃ الاخبار (آگرہ)، صادق الاخبار (دہلی)، آفتابِ عالم تاب (دہلی) اور اکمل الاخبار (لکھنو) بطور خاص شامل ہیں۔(۴۶)

غالب کی وفات کا ذکر ویسے تو کم وبیش تمام اخبارات نے کیا ہے لیکن ''اکمل الاخبار'' لکھنؤ (بابت ۱۷ر فروری ۱۸۶۹ء) اس سانحہ ارتحال کو جس انداز میں شائع کیا ہے وہ از خود غالب شناسی میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> فغاں اس زمانہ غدار سے' آہ روزگار نا ہنجار سے' ہر روز نیا رنگ دکھاتا ہے' ہر دم دامِ غم والم میں پھنساتا ہے' اس محیط آفت کی موج بلا خیز ہے' اس وادی ہولناک کی ہوا فتنہ انگیز ہے۔ اس کا آب سراب' اس کی راحت جز و جراحت' اس کی رافت سرمایہ صداقت' اس کی شکر زہر آلود' اس کی امید آرزوئے فرسودہ' ہر روز محل حیات کو صرصر ممات سے گراتا ہے' ہر دم محفل سرور سے صدائے ماتم اٹھاتا ہے..... پھول ادھر کھلا' ادھر گر پڑا' لالہ لباس رنگین میں بھی داغ دل پر رکھتا ہے' غنچہ خونِ جگر سے پرورش پاتا ہے۔ بلبل نوحہ گر چمن ہے اور مرغِ سحر خواں اسیر محن:
>
> در ایں زمانہ بہار و خزاں ہم آغوش است
> زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است
>
> کیا عجب اگر زمانہ درپے آزار ہے۔ بھلا اس سے کیا توقع آسودگی جس کا خود گردش پر مدار ہے۔ دیکھو بیٹھے بٹھائے کیا آفت اُٹھائی ہے' کس منتخب روزگار کی جدائی دکھائی ہے۔ نخل برومند معانی کو بادِ خزاں سے گرایا۔ مہر سپہر سخن دانی کو خاک میں ملایا۔ جو خسرو کے بعد ملک سخن کا خسرو مالک رقاب تھا۔ اس کا نامہ عمر طے ہوا۔ جو میدانِ سخنوری کو شہسوار مالک رقاب تھا' اس کا رختِ زندگی پے ہوا۔ ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا ذکر کیا جائے' دریا کوزے میں کیوں کر سمائے۔ حسنِ خلق میں اخلاق کی کتاب' عمیم الاشفاق میں لاجواب' خوبی تحریر میں بے نظیر' صافی ضمیر' جادو تقریر۔ فارسی زبان میں لاثانی' اُردوئے معلّٰی کے بانی' افسوس! جس کا شہبازِ خیال طائر سدرہ شکار ہو' وہ پنجہ گرگِ اجل میں گرفتار ہو..... اس غم سے سب کی حالت تباہ ہے۔ روز بھی اس مصیبت میں سیاہ ہے۔ اب توضیح اجمال و تفصیل مقال ہے۔ واضح ہو کہ جناب مرحوم دو تین مہینے سے صاحب فراش رہے' ضعف و نقاہت کے صدمے سہے۔ آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا۔ اس دنیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا تا آنکہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ر ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری روز دوشنبہ کو دو پہر ڈھلے اس خورشید اوج فضل و کمال کو زوال ہوا..... (۴۷)

۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد غالب کے حالات و کلام کے بارے میں سب سے پہلا مضمون' مسعود حسن رضوی ادیب کے مطابق ماہوار رسالے ''ذخیرہ بال گوبند'' میں شائع ہوا۔ وہ اس سلسلے میں تفصیلاً لکھتے ہیں:

> اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ہے: ''مرزا اسد اللہ خان متوفی المختلص بہ غالب ونوشہ''۔ غالبؔ کی وفات ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالب کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے غالبؔ کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ (۴۸)

یہ مضمون ساڑھے تین صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔لیکن اسی نوعیت کا ایک اور مضمون جو ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء کے ''اودھ اخبار'' لکھنو میں شائع ہوا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری' غالبیات کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کی نظر سے عموماً پوشیدہ ہے۔(۴۹)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق گارسان دتاسی نے بھی اپنی معروف کتاب ''تاریخ ادب ہندوستانی'' میں اس مضمون کو بالاختصار نقل کر دیا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو غالب شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے:

> دہلی کے عہد خوشحال کے وہ تمام شعراء جو اپنے ہم وطنوں میں مشہور تھے۔ ایک ایک کر کے اٹھ گئے تھے۔ صرف ایک رہ گیا تھا وہ بھی ہم سے چھین لیا گیا اور مشہور و ممتاز شاعروں کا خاتمہ ہو گیا۔ میرا مطلب شکرستانِ سخن کے اسد اور چمن فارسی کے اس بلبل سنج سے ہے جو اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اگرچہ وہ اس عارضی دنیا کو چھوڑ کر ابد آباد کو سدھارے ہیں لیکن ان کا نام اس دنیا میں ہمیشہ زندہ یادگار رہے گا۔ ہندوستان میں کوئی ایسا تعلیم یافتہ آدمی نہیں ہے' جو ان کی استادی اور ان کے کلام کی عظمت کا قائل نہ ہو۔ ظاہر ہے ایسے شخص کے حالاتِ زندگی ہمارے لئے افادیت سے خالی نہ ہوں گے.....آخری وقت تک انہوں نے جو کچھ کہا' اس میں بھی زندگی کی حرارت' تازگی اور طبیعت کی شگفتگی اور خوش مذاقی کا اثر نمایاں ہے۔ ان کے لطیفے روزمرہ کی زندگی میں کھانے میں نمک کا کام دیتے ہیں۔(۵۰)

غالب کی حیات و فکر پر ایک نادر تحریر میر مہدی مجروح کا وہ دیباچہ ہے جو انہوں نے خطوط غالب کے مجموعے ''اردوئے معلیٰ'' کے لئے تحریر کیا تھا۔ یاد رہے یہ مجموعہ غالب کی وفات کے چند روز بعد اشاعت پذیر ہو سکا تھا۔ اس دیباچے میں انہوں نے اس مجموعے کے جامعین کی نشاندہی بھی کی ہے اور ساتھ ہی غالب کی منظوم اور نثری خدمات کو سراہتے ہوئے ان کے منفرد اسلوب اور توانا لہجے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> حضرت کا جو سخن ہے وہ درعدن' جو بات ہے از رہ معنی کرامات ہے۔ یہ نثر کی رنگینی' یہ نظم کی شیرینی' یہ غزل کی فصاحت' یہ قصیدہ کی متانت' یہ لفظوں کی محبوبی' یہ ترکیب کی خوش اسلوبی' یہ جدت معانی' یہ طلاقتِ لسانی' یہ سلاستِ عبارت' یہ روانی مطالب دیکھی نہ سنی۔ سطریں ہیں کہ موتی کی لڑیاں ہیں۔ باتیں ہیں کہ مصری کی ڈلیاں ہیں۔ نثر نثار پر نظم انجم قرباں' حسنِ تقریر پر تحریر شعاع سے نثار کرنے کو آفتاب زر بدامان' گفتار شکر بار کو جادو کہوں' سحر کہوں' حیران ہوں کیا کہوں ..... جب حضرت کو دیکھ لیا گویا سب سخندان پیشینہ کو دیکھ لیا۔ جب حضرت کا کلام سن لیا سب کا کلام سن لیا۔ مبین میرے قاول کی یہ اردو کی تحریر ہے کہ سہل الممتنع کیا بلکہ ممتنع النظیر ہے۔ اس اردو کا نیا انداز ہے کہ جس کے دیکھنے سے روح کو اہتزاز ہے۔ جو کہ بعد تکمیل ہو جانے کلیات نظم و نثر فارسی کہ وہ ہر ایک آویزہء گوش فصاحت و پیرایہ گلوئے بلاغت ہے اور ہندوستان سے ایران تک ہر ایک نکتہ سنج کے ورد زبان ہے۔ مدت سے حضرت کو اس طرز نو ایجاد اردو سے لگاؤ ہے اور خط و کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے۔(۵۱)

غالب کی زندگی میں جو تذکرے لکھے گئے اور ان میں غالب کا ذکر جہاں جہاں آیا ہے اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ البتہ غالب کی وفات کے بعد جو تذ کے تصنیف ہوئے اور ان کے صفحات ذکر غالب سے مزین کئے گئے۔ یہاں بطور نمونہ ان میں سے چند تذکروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سید محمد صدیق حسین خان کا تذکرہ ''شمع انجمن'' جو کہ ۱۸۷۶ء میں تصنیف ہوا۔ اس میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

> خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر' شاہجہان آباد کے نامی سخنوروں میں سے ہے' قوتِ فکرِ خداداد کا مالک ہے۔ اشعار کی خوش وضع بنیاد تعمیر کرتا ہے اور دلکش معنی اختراع کرتا ہے۔ بیشہء سخن پروری کا شیر ہے اور معنی گستری کی ولایت کا فرمانروا۔ نثر و نظم میں طرزِ خاص کا مالک ہے اور دلنشیں تراکیب ایجاد کرتا ہے۔ ان کی بہت سے معاصر نثر نویسی اور شعر گوئی میں ان کے کمال کے قائل ہیں۔ (۵۲)

اسی طرح ایک اور تذکرہ' جس کا ذکر اکبر علی خان نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ''شمیم سخن'' کے نام سے تصنیف ہوا اور عبدالحئی صفا بدایونی اس کے مصنف ہیں۔ اکبر علی خان نے مذکورہ تذکرہ سے جو اقتباس درج کیا ہے وہ یہ ہے:

> غالب و اسد تخلص' نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں غالب عرف نوشہ دہلوی' خلف مرزا عبداللہ بیگ خاں تورانی' مولد اکبر آباد مسکن دہلی ہے' طبیعت دشوار پسند و خیالات عالی تھے۔ ۱۲۸۵ھ میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ نادر دہلوی اپنے تذکرہء شعرائے دکن میں لکھتے ہیں کہ بعض ثقات کی زبانی معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کو شاہ نصیر مرحوم سے تلمذ حاصل تھا' واللہ عالم۔ یہ قول نادر کہاں تک صحیح ہے مگر اس میں شک نہیں مرزا صاحب اپنے عہد میں لاجواب تھے۔ (۵۳)

سید نورالحسن خاں کا تذکرہ ''طور کلیم'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس تذکرہ کا سنِ اشاعت ۱۸۷۸ء ہے۔ اس میں غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے' اس سے ان کی علمی خدمات کے بارے میں بنیادی باتیں منظر عام پر لائی گئی ہیں جو غالب شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سید نورالحسن لکھتے ہیں:

> فخرِ عرفی و غیرت طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان المخاطب بہ نجم الدولہ' دبیر الملک' نظام جنگ بہادر افراسیاب کی نسل سے تھے۔ اکبر آباد میں مولد تھا اور دہلی مسکن۔ لفظ ''غریب'' تاریخ ولادت ہے۔ وفات ۱۲۸۵ھ میں واقع ہوئی۔ ''پنج آہنگ''، ''دستنبو''، ''مہر نیم روز'' اور ''قاطع برہان'' ان کی تالیفات میں سے ہیں۔ فارسی زبان میں بھی ایک دیوان رکھتے ہیں۔ ابیات کا مجموعہ بھی ہے۔ اوّل اوّل مرزا بیدل کی روش اختیار کی۔ آخر الامر بڑا پسندیدہ انداز ایجاد کیا۔ اپنے دیوان ریختہ میں سے بہت سے اشعار نکال دیے ہیں اور قلیل تعداد میں انتخاب کر لیے ہیں۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے' جو غزلیات کے بعض مقطعوں میں اب بھی موجود ہے۔ پچاس سال ان کی مدتِ مشق ہے۔ فارسی گوئی میں ان کا پایہ فحول شعراء سے کم نہیں اور ریختہ کی حالت بھی یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی ہم مرتبہ ہے تو لائیں۔ اگر حدیقہء نظم کے لیے نو بہار ہیں تو عرصہ نثر میں بھی مرد کار ہیں۔ جمیع اصنافِ سخن پر جو قدرت انہیں حاصل ہے' بیان سے باہر ہے۔ (۵۴)

سید نور الحسن کے مذکورہ بیان میں غالب کے مرتبے کو جس اوجِ کمال پر پرکھا گیا ہے اس سے یہ امر کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ اس عہد میں بھی غالبؔ کی بلند خیالی اور اعلیٰ قدر و منزلت کا اعتراف کھلے لفظوں میں کیا جاتا تھا۔

امیر مینائی کا تذکرہ ''انتخاب یادگار'' ۱۸۷۹ء میں منظر عام پر آیا۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں غالبؔ کے مختصر حالاتِ زندگی، خاندان، نسب، توطن وفات وغیرہ کے ساتھ ساتھ ان کی کتب کا تعارف کرایا ہے اور آخر میں غالب کے فن پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> معلومات ان کی زبانِ فارسی میں کالشّمس فی رابعۃ النہار آشکار ہے۔ نثر و نظم اُردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے.....الحاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے۔ اس سرکارِ فیض آثار کے نمک خوار قدیم ہیں۔ جناب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خان صاحب بہادر فردوس مکان طاب ثراہ کو ان سے تلمیذ ہے۔ (۵۵)

اس دور کے تذکروں میں نمایاں حیثیت جس تذکرے کو حاصل ہے وہ مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ ''آبِ حیات'' ہے دیگر تذکروں میں سے اسے منفرد مقام بھی حاصل ہے اور یہ زیادہ مقبول عام بھی ہوا ہے۔ آزادؔ نے اگرچہ اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوقؔ کو غالبؔ پر فوقیت دینے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں غالبؔ کے بعض مبینہ غیر مثبت رویوں کو مبالغہ آمیز انداز میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے غالب کی حیات اور ان کے فن سے متعلق بیش بہا معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ دیگر تذکروں کی نسبت ''آبِ حیات'' میں غالب کے لیے صفحات کی خاصی بڑی تعداد ہے۔ اگرچہ آزادؔ نے غالب کے حالات اور طبعی عادات کا ذکر تفصیلاً کیا ہے لیکن غالب کے اسلوب اور فن سے متعلق جو نادر باتیں کہی ہیں وہ بھی غالب شناسی کی زندہ روایات کی امین ہیں۔ لکھتے ہیں:

> اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشے کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اوّل، کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا، اس لئے اکثر اشعار اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں۔ لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے .....ان کے خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطائف کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزہ لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں۔ (۵۶)

سید صغیر بلگرامی کا شمار بھی اہم تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ''تذکرہ ءجلوہ ءخضر'' ان کی یادگار تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ بلگرامی نے غالبؔ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس عہد کے دیگر نامور شعراء مثلاً میر تقی میرؔ، ناسخ اور ذوق جیسے شعراء کے ساتھ موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز فارسی شاعری میں وہ ہندوستان کے صرف چار شعراء کے نام گنواتے ہیں جن میں غالب بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں وہ غالب کے خطوط پر بھی

جامع تبصرہ کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی غالب کے بارے میں ان کی رائے درج ذیل اقتباسات پر مشتمل ہے:

> یہ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اُردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولائیتی فارسی کا یقین چار شخصیتوں کے کلام پر ہوا۔ اوّل امیر خسرؒ دوم حسن دہلوی، سوم مرزا بیدل، چہارم غالب.....اُردو نظم بھی ایک طور خاص کی کہی۔ اس میں بھی ایجاد خاص ہے۔ آخر میر تقی میر کا رنگ بالکل اُتار لیا۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عادت سے اس کو بلند کر دیا یعنی نہ ناسخ کی طرز رہی نہ دہلی کی.....ذوق کو ان سے کچھ مناسبت نہیں تھی۔ اُردو نثر میں پوری واقعہ نگاری کا ایجاد انہیں کا ہے، ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی۔ اُردوئے معلیٰ انہیں جواہر بھرے خطوط کا مخزن ہے جس میں اس نئی ایجاد کا رنگ ہے۔ (۵۷)

گزشتہ صفحات میں غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر تذکرہ نگاروں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے بعض تذکرے ان کے ہم عصر تھے جو ان کی شاعری کے مجموعی مزاج سے بھی واقف تھے اور انہوں نے ان کی ذاتی زندگی کو بھی قریب سے دیکھا تھا۔ تذکرہ نگاروں کے بیانات کی روشنی میں ایک بات پایہء ثبوت تک پہنچتی ہے کہ غالب کے فن نے اپنے ہم عصروں کے دلوں میں ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ مجموعی طور پر تذکرہ نگاروں نے جو آراء قائم کی ہیں ان میں کم وبیش سب نے ایک مشترک رائے کا اظہار ضرور کیا ہے کہ غالبؔ اپنے زمانے کے اہم شاعر تھے۔ تذکروں میں غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک اجمالی قسم کے جائزوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کسی تفصیل کی توقع نامناسب ہے۔ بہرحال غالب کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں غلام مصطفیٰ خان شیفتہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی یہی رائے قائم کی ہے، لکھتے ہیں:

> شیفتہ کو غالب کا اہم نقاد کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اختصار کے ساتھ جو کچھ غالب کے بارے میں کہا ہے، اس میں ان کے کلام کی مزاج دانی کا صحیح شعور اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ (۵۸)

غالبؔ کے بارے میں باقاعدہ تنقید کا آغاز مولانا الطاف حسین حالیؔ سے ہوتا ہے۔ اگرچہ غالب کے انتقال پر مولانا حالیؔ کا مرثیہ بھی غالب کی شاعرانہ اور فن کارانہ شخصیت کا غماز ہے لیکن ظاہر ہے کہ حالیؔ کا یہ مرثیہ ایک شعری کارنامہ ہے، تنقیدی کارنامہ نہیں ہے۔ لیکن غالبؔ پر حالیؔ کا تنقیدی شاہکار ''یادگارِ غالب'' ہے جس میں انہوں نے غالب کی زندگی اور شخصیت کی بڑی دلآویز تصویر کھینچی ہے۔ یہ غالب کے حیات وفن پر پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ اگرچہ یہ کتاب مولانا آزادؔ غیر منصفانہ بیانات کے ردعمل کے نتیجے میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں غالب کے سوانح اور اُردو، فارسی نظم ونثر پر مفصل تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند:

> یادگار کا تیسرا حصہ، یعنی تنقید بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ حالیؔ نے غالبؔ کے رشحاتِ قلم پر چار حصوں میں تنقید کی ہے: اُردو نظم، اُردو نثر، فارسی نظم، فارسی نثر۔ اُردو شاعری کی تنقید میں اوّل انہوں نے کچھ خصوصیات گنائی ہیں۔ مثلاً تشبیہیں، استعارہ وکنایہ، شوخی وظرافت، پہلو دار اشعار، معنی آفرینی اور جدت ادا وغیرہ۔

اس کے بعد بڑی تعداد میں مرزا کے منتخب اشعار درج کئے ہیں اور ان کی خوبی کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں۔ آج جو ہم غالب کے بعض پہلو دار اشعار کے لطیف معنوں سے محظوظ ہوتے ہیں، وہ یادگار ہی کی دین ہے۔ شاید انہوں نے یہ معنی غالبؔ سے سنے ہوں گے۔ تنقید کا یہ طریقہ کسی قدر فرسودہ ہوسکتا ہے، لیکن اس سلجھے ہوئے طریقے سے غالب فہمی میں جتنی مدد ملتی ہے، وہ بعد کے نمائشی تبصروں سے نہیں ملتی۔ (۵)

مولانا حالیؔ کی تنقید اس اعتبار سے نئی ہے کہ اس میں کلامِ غالب کے بعض ایسے پہلوؤں کا سراغ لگایا گیا ہے، جو ان کے فن میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حالی نے شخصی اور اجتماعی حالات کو عوامل و محرکات قرار دے کر غالب کی شاعری کے ان پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ اس لئے ان کے اس اندازِ تنقید میں گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے کلام پر ان کی تنقید آج بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ غالب کی جدت پسندی اور روایت شکنی پر تبصرے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل اور بے معنی کہو یا اس کو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اوریجنلٹی اور غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہ ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلتا جاتا ہے، اس پر آنکھیں بند کر کے گلے کے پیچھے پیچھے ہولیے۔ لیکن لیک سے ادھر اُدھر آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا..... برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں اوریجنلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی میں ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی، مرزا کی طبیعت اس قسم کی واقع ہوئی تھی۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ (۶۰)

مولانا حالی اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے غالب کا موازنہ میرؔ و سودا اور ان کے مقلدین سے کرتے ہیں اور غالب کو ایک نئے طرز اور نرالی کیفیت کا شاعر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں، تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ (۶۱)

''یادگارِ غالب'' جہاں غالب کی زندگی کا جامع مرقع ہے وہاں کلامِ غالب کی تفہیم و توضیح کے لئے بھی اس کتاب سے بڑی مدد ملتی ہے۔ حالیؔ چونکہ غالب کے شاگرد بھی تھے اور کچھ عرصہ ان کی صحبت میں رہ چکے تھے اور اکثر و بیشتر غالب سے ان کے اشعار کے مطالب بھی پوچھ لیا کرتے تھے، اس لیے انہوں نے ''یادگار'' میں کئی ایک مقامات پر اشعار کی تشریح اس انداز سے کی ہے جس سے اس کتاب کے شرح ہونے کا وصف واضح طور پر ابھر آتا ہے۔ کلامِ غالب کی جس

قدر شرحیں لکھی گئی ہیں، شارحین حضرات نے کسی نہ کسی حوالے سے ''یادگارِ غالب'' سے ضرور استفادہ کیا ہے شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق:

> تفہیم غالب کا باقاعدہ رواج حالی کی دو کتابوں ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور ''یادگارِ غالب'' سے شروع ہوتا ہے۔ غالب کا کوئی بھی شارح حالی سے استفادہ کیے بغیر اپنے کام کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ (۶۲)

مولانا حالی کی تشریح کا انداز کیا تھا اور غالب کے مہمل اور مشکل اشعار کی انہوں نے کس طرح صراحت کی ہے، ذیل میں نمونے کے طور پر ایک شعر کی تشریح نقل کی جاتی ہے:

> ''رکھا غفلت نے دور افتادہء ذوقِ فنا ورنہ
> اشارت فہم کو ہر ناخنِ بَرّیدہ ابرو تھا
>
> کہتا ہے فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لئے ہر ایک ناخن جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے، ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ و ایماء کرنا اور ناخنِ بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے، وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا، کیوں کہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے، لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ (۶۳)

حالی نے بعض اشعار کے مطالب غالب سے بھی پوچھے تھے جنہیں ''یادگارِ غالب'' کی زینت بنایا ہے۔ ایسے ہی ایک شعر کا ذکر نمونہ کے طور پر کیا جاتا ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

> بعض اسلوبِ بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ ان سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں، مثلاً ان کے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے: ؎
>
> قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
> اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے
>
> میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ 'اے' کی جگہ 'جز' پڑھو، معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں، ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہراً یہ انہی کی اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ ''اگر وہ اے کی جگہ جز کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے:
>
> ''اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے''
>
> تو مطلب صاف ظاہر ہو جاتا۔ اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بہ مقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔ (۶۴)

حالؔی نے بحیثیت مجموعی غالب کے کلام کی چار خصوصیات گنوائی ہیں۔اوّل غالب کی جدت طرازی جس میں وہ اپنے دیگر ہم عصر شعراء سے ممتاز نظر آتے ہیں۔دوم وہ خصوصیت جس کو ہم آج کی اصطلاح میں رمزیت' ایمائیت یا لطیف ابہام کہتے ہیں اور جس کو موجودہ عہد میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔حالی نے غالب کی شاعری کے اس پہلو کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ان کی شاعری کے انداز کی صحیح کیفیت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔سوم شوخی اور ظرافت ہے جس کی وجہ سے غالب کے کلام میں چاندنی کی مسکراہٹ کا سماں نظر آتا ہے اور شگفتگی اور شادابی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔حالی کے نزدیک غالب کے کلام کی چوتھی خصوصیت تہہ در تہہ معنویت ہے اور وہ اشاروں' کنایوں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی بلیغ باتیں کرتے ہیں۔بظاہر اس میں ایک معنویت نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں معنویت کا دوسرا پہلو بھی واضح طور پر نظر آتا ہے۔

مولانا حالی آخر میں فارسی اور اُردو کے نامور شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے غالب کی شاعری کو قدما کی شاعری سے نسبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> بہرحال جو نسبت ظہوریؔ' نظیریؔ' عرفیؔ' طالبؔ اسیرؔ وغیرھم کے کلام کو سعدیؔ' خسروؔ' حافظؔ اور جامیؔ کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میرؔ سوداؔ اور دردؔ کے ریختہ سے سمجھنی چاہیئے۔قدمائے اُردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے' برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیاں میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے۔(۶۵)

''یادگارِ غالب'' پہلی مرتبہ ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی اس کے ایک سال بعد سید امام آثرؔ کا تذکرہ ''کاشف الحقائق'' معروف بہ ''بہارستانِ سخن'' منظرِ عام پر آیا۔اس میں انہوں نے غالبؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی بارہ غزلیں نقل کی ہیں اور کہا ہے کہ اگر کوئی شاعر ان جیسی بارہ غزلیں بھی تصنیف کرلے تو اس کے زندہ شاعر ہونے کے لئے کافی ہیں۔اسے ضخیم دیوان ترتیب دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ذیل میں سید امام آثرؔ کا جامع بیان اور بارہ منتخب غزلوں کے مطلعے درج کئے جارہے ہیں' ملاحظہ ہوں:

> چونکہ غزل سرائی حضرت غالبؔ کی سوز و گداز' درد و محبت' خستگی' برشتگی' نشتریت' عالی خیالی' دل آویزی' خوش مذاقی' شیریں بیانی' نفیس پسندی' شوخی' رفعت' مکنت' جلالت' متانت وغیرہ سے معمور ہے۔اس لئے چند پوری غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں کہ حضرت ناظرین اُن سے حظِ روحی اٹھائیں.....

غزل نمبر۱

درد منت کشِ دوا نہ ہو
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہو

غزل نمبر۲

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

غزل نمبر۳

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

غزل نمبر۴

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

غزل نمبر۵

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غزل نمبر۶

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

غزل نمبر۷

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

غزل نمبر۸

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

غزل نمبر۹

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

غزل نمبر۱۰

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

غزل نمبر۱۱

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

غزل نمبر۱۲

مدت ہوئی یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

فقیر کی دانست میں اگر کوئی شاعر اپنی تمام عمر میں صرف بارہ غزلیں ایسی جو بالا میں رقم ہوئیں' تصنیف کرے تو اسے صاحبِ دیوان ضخیم ہونے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ غزلیں اعلیٰ درجے کی غزل سرائی کی خبر دیتی ہیں۔ علاوہ ان کے اور بھی غزلیں دیوانِ غالب میں موجود ہیں' جو انتخاب کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ بارہ غزلیں تو صرف نمونہ کے طور پر درج کی گئی ہیں۔ بہرحال یہ بارہ غزلیں اہل انصاف کو رائے قائم کرنے کے واسطے کافی ہیں۔(۶۶)

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں میرزا حیرتؔ دہلوی کی غالبؔ پر ایک نادر تحریر منصۂ شہود پر آئی۔ ''ختم الشعراء میرزا نوشہ'' کے عنوان سے ان کا مضمون' ماہنامہ ''چراغ دہلی'' کے دسمبر۱۹۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوا' جس میں انہوں نے غالب کی شاعری کے مخصوص رنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ختم الشعراء میرزا نوشہ جن کی وفات دہلی میں ۱۸۶۹ء میں ہوگئی' عجیب پایہ کا شاعر گزرا ہے۔ اور جس نے سچ تو یوں ہے کہ شاعری کو دہلی میں ختم کر دیا۔ میرزا صاحب کے بعد اور بھی شاعر گزرے ہیں اور اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں لیکن کسی خاص رنگ کے موجد نہیں ہوئے اور اگر ہماری واقفیت ناقص نہیں ہے تو اس زمانہ میں بھی کوئی ایسا نظر نہ آئے گا جو موجد ہو کسی رنگ کا.....میرزا نے اُردو میں جدت پیدا کی تھی اور ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ میرزا کا یہ نو ایجاد رنگ قبول کر لیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی زبان میں میرزا نے وہ مہارت اور مقبولیت پیدا کی تھی کہ ایرانی بھی عش عش کرتے تھے۔(۶۷)

غالب پر انگریزی زبان میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس کا آغاز جس مضمون سے ہوتا ہے وہ ۱۹۱۲ء میں "Ghalib: An Appreciation" کے عنوان سے لکھا گیا۔ صلاح الدین خدا بخش' مضمون نگار ہیں۔ بعد ازاں اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ تاہم زیر بحث مضمون جس کا اردو ترجمہ شائع ہوا' ذیل میں اس اُردو ترجمے سے اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے غالب شناسی کی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مضمون نگار نے غالب کی نثر اور شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

غالب اعلیٰ درجے کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کا نثار بھی ہے۔ وہ ہمارے دور کا سب سے بڑا نثر نگار ہے اتنا بڑا کہ اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ اس کی دلفریب لطافت' اس کی مسرت بخش سادگی' اس کی نکتہ سنجی اور ظرافت' اس کی دلکش روانی' اس کا ہلکا پھلکا اندازِ بیاں' اس کی بے ساختگی اور دل ربائی' یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے سبقت لے جانے والا تو کیا حریف بھی پیدا نہیں ہوا.....اس غیر فانی نام کی چمک میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی واردات قلب کے اس عجیب و غریب

مجموعے یعنی ''دیوان مرزا اسداللہ خاں'' کی قدر دانی ترقی کرتی رہے گی ۔(۶۸)

پیارے لال شاکر میرٹھی کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ انہوں نے ''مرزا غالب دہلوی کی شاعرانہ عظمت'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا جو سہ ماہی ''ادیب'' الہٰ آباد کے جولائی تا ستمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہاں اس مضمون کا حوالہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ شاکر میرٹھی نے غالب کی عظمت بیان کرتے ہوئے انہیں دہلی میں ذوقؔ پر اور لکھنو میں آتشؔ پر فوقیت دی ہے۔ اور ثبوت میں تقابلی اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ یہ تقابلی جائزہ بلاشبہ ''غالب شناسی'' کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لکھتے ہیں:

> ذوق کے پختہ کار اور نازک خیال شاعر ہونے میں شبہ نہیں' لیکن غالبؔ کو وہ کسی طرح نہیں پہنچتے۔ انہوں نے جو سہرا غالبؔ کے سہرے کے جواب میں بایمائے بہادر شاہ لکھا اپنی جگہ بہت اچھا ہے لیکن انصاف پسند طبعیتیں اسے غالب کے سہرے پر کبھی ترجیح نہیں دے سکتیں۔ اس طرح غالبؔ اور ذوقؔ کی اکثر غزلیں ہم طرح ہیں اور ان کے دیکھنے سے دونوں کا فرق دریافت ہوسکتا ہے۔ ذوق کا مطلع ہے۔
>
> ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے
> ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے
>
> شعر بہت اچھا ہے' لیکن قافیہ اور قریب قریب اسی مضمون کا شعر غالب نے نہایت نازک کہا ہے
>
> نویدِ امن ہے بے دادِ دوست جاں کے لئے
> رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
>
> ذوق
>
> نہ دل رہا نہ جگر' دونوں جل کے خاک ہوئے
> رہا ہے سینہ میں کیا چشم خونفشاں کے لئے
>
> غالب
>
> بلا سے گر مژہء یار تشنہء خوں ہے
> رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے
>
> غالبؔ کے شعر میں ایک قسم کی جدت ہے اور ذوق نے بالکل معمولی طور پر ایک پامال مضمون کو نظم کر دیا ہے۔

لکھنو کے استادوں میں آتش کا مرتبہ بہت بلند ہے اور صفائی کلام کے اعتبار سے وہ اپنے لکھنوی ہم عصر ناسخؔ سے بہت آگے ہیں۔ لیکن غالبؔ کی بات ان میں بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ غالب چونکہ عامیانہ تقلید سے قطعی متنفر تھے' اس لیے ان کا ہر شعر جدت کا پہلو لیے ہوتا ہے اور یہ صفت کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔ آتش کہتے ہیں

جب اشتیاق لکھا ہے خونخوار یار کو
قاصد کا کشتہ آیا ہے خط کے جواب میں

اگرچہ اشتیاق کی تعریف خونخوار زیادہ موزوں نہیں' تاہم شعر صاف ہے' لیکن غالب نے ''جواب'' کا

قافیہ نرالا باندھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر کا مضمون سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ کس قدر بلیغ ہے۔ محبوب کی مزاج شناسی کی تمثیل اسی سے زیادہ دلچسپ ہو نہیں سکتی۔(۶۹)

عبدالماجد دریا آبادی کا شمار اُردو کے نامور لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے غالب پر جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے مضامین ہیں جو اس عہد کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ بحث ان کا ایک مضمون ''غالب کا فلسفہ'' کے عنوان سے ہے جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے غالب کی شاعرانہ فکر میں ''فنا'' کا رنگ بدرجہءاتم محسوس کیا ہے اور غالبؔ کی اس فکر کو ایک برطانوی فلسفی کی فکر کے مماثل قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی غالبؔ کے اشعار اور خطوط سے حوالے دے کر اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

فنا کا رنگ غالبؔ پر شروع سے غالب رہا۔ شوخیوں اور رنگینیوں کے درمیان غالب رہا' رندی اور آزاد مشربی کے باوجود غالب رہا' کہیں کہیں تو یہ لَے ہلکی ہے' دھیمے سروں میں کہتے ہیں:

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دلِ غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

لیکن اکثر یہ مستقبل کا صیغہ حال سے بدل گیا ہے اور صاف صاف کہنے لگے ہیں کہ یہ وجود اب بھی نابود ہے۔ اس کاروبارِ حیات کی مثلِ طلسمات نمود ہے' حقیقتاً معدوم اور صرف بظاہر موجود ہے۔ کہتے ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقہءِ دامِ خیال ہے

برطانیہ میں ایک فلسفی عرصہ ہوا' برکلے کے نام سے گزرا ہے' وہ بھی کچھ ایسی ہی تعلیم دے گیا ہے.....
تلاش کیا جائے تو دیوان بھر میں شاید ہی مضمون سب سے زیادہ نکلے۔ خدا جانے کتنے مختلف طریقوں سے اسے پیش کیا ہے۔(۷۰)

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں غالب پر تحقیقی نوعیت کا کام ہوا۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزادؔ نے پہلی مرتبہ غالبؔ کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام کو منظرِ عام پر لا کر علمی و ادبی دنیا کو غالب شناسی کے ایک نئے رُخ سے آشنا کیا۔ اور یہ روایت آگے چل کر غالب پر تحقیق کے نئے در وا کرتی ہے۔

مولانا آزادؔ نے ۱۹۱۴ء میں ''الہلال'' کی تین اور ''البلاغ'' کی ایک اشاعت میں مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام شائع کیا۔ اس سلسلے کی پہلی قسط کے ساتھ ''الہلال'' میں ایک اداریہ بھی ''مرزا غالب مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام'' کے عنوان سے رقم کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی جستجو کرنے اور دیوانِ غالب کا مکمل

ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت کی طرف بھی ''الہلال'' کے اسی اداریے نے توجہ دلائی۔ مولانا لکھتے ہیں:

> آخری زمانے میں جس قدر کلام کہا گیا' وہ (دیوانِ غالب) کے نئے ایڈیشنوں میں داخل نہیں ہوا۔ جو ایڈیشن غدر سے پہلے دہلی میں چھپا تھا' اسی کی نقلیں چھپتی رہیں۔ بہ خلاف کلیات نظم فارسی کے جس کا پہلا ایڈیشن اور موجودہ ایڈیشن دونوں میرے پاس موجود ہیں' مگر دونوں کے قصائد وغزلیات وقطعات کی تعداد میں بڑا فرق ہے.....اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات فارسی نظم کے ہر ایڈیشن میں نیا کلام شامل کر دیا جاتا تھا' مگر افسوس کہ اُردو دیوان کی قسمت اس باری میں نارسا رہی' اور نیا کلام اس میں شامل ہوتا نہ رہا۔ اس کا ثبوت وہ معتد بہ غزلیں ہیں جو بعض حضرات کے پاس قلمی موجود ہیں اور مطبوعہ دیوان میں ان کا پتا نہیں۔ (۷۱)

مولانا ابوالکلام آزاد آگے چل کر وضاحت کرتے ہوئے غالبؔ کے کچھ غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی بھی کرتے ہیں' وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> اس قسم کے غیر مطبوعہ کلام میں سے دو اُردو رباعیوں میں نے اس مطبوعہ نسخے کے حاشیے پر خود مرزا صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں' جو انہوں نے خواجہ فخر الحسن دہلوی مصنف ''سروشِ سخن'' کو دیا تھا اور دو قصیدے' دو قطعے' ایک قطعہء تاریخ' تین غزلیں اُس قلمی نسخے میں ہیں جو نواب سعید الدین احمد خان طالبؔ' رئیس دہلوی کے پاس موجود ہے۔ اس مرتبہ دہلی میں وہ نسخہ میرے پاس رہا اور میں نے تمام غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے لی۔ (۷۲)

مولانا آزاد کی نگاہ میں مرزا غالب کی جو قدر ومنزلت تھی' محلولہ بالا مضمون میں اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ انتہائی درد وسوز سے لکھتے ہیں:

> مرزا غالبؔ نے عمر بھر بہادر شاہ ظفر کی لاحاصل مداحی کی تھی' اور وہ قصیدے' جو عرفی ونظیری کے قصاید کے مقابلے کا دم رکھتے ہیں' ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کئے تھے جس کے سر پر جہانگیر وشاہجہان کا تاج تو ضرور تھا' پر نہ تو عرفی ونظیری کی قدر شنائی کا ہاتھ تھا اور نہ کلیم کو زرِ خالص سے تُلوا کر بخشش کرنے والا خزانہ.....۔ (۷۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے شماروں میں مرزا غالب کا جو غیر مطبوعہ کلام شائع کیا ہے ان میں دو قصائد اور دو غزلیں شامل ہیں۔ ذیل میں اُن کے مطلعے درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ قصیدہ در مدح میکلوڈ بہادر:

کرتا ہے چرخ روز بصد گو نہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام (۷۴)

۲۔ غزل:

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں (۷۵)

۳۔ غزل وقطعہ:

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بَن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ (۷۶)

۴۔ قصیدہ درتہنیتِ غسلِ صحت نواب یوسف علی خاں:

مرحبا سال فرخی آئیں
عید شوال و ماہ فروردیں (۷۷)

محولہ بالا غیر مطبوعہ کلام میں تیسرے نمبر پر جس غزل کا مطلع درج کیا گیا ہے' اسے مولوی عبدالحق نے بھی رسالہ ''اُردو'' میں شائع کیا تھا۔ ساتھ یہ نوٹ بھی دیا تھا:

> نواب احمد سعید خان طالبؔ فرماتے تھے کہ مرزا کی سب سے آخری غزل' جس کے چند ہی روز بعد وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے' یہ ہے.....شب وصال میں الخ.....طالب مرحوم کی قلمی بیاض سے نقل کر کے ایڈیٹر ''الہلال'' نے اپنے اخبار میں شائع کیا' اور اس سے مطبع نظامی بدایوان نے اپنے نسخہء دیوانِ غالب کے آخر میں شامل کر دیا ہے۔(۷۸)

مولانا ابوالکلام آزادؔ کا یہ مقالہ اس وقت لکھا گیا جب غالبؔ کی شاعری اور ان کی زندگی کو کسی نے بھی تحقیق کا موضوع نہیں بنایا تھا۔ مولانا آزادؔ کے پیشِ نظر غالبؔ پر کوئی تحقیقی مقالہ لکھنا نہ تھا' بلکہ غالب کا جو غیر مطبوعہ کلام انہوں نے ''الہلال'' میں شائع کرنا تھا' اس کے لئے دیباچے کے طور پر یہ اداریہ لکھا گیا تھا۔

اُردو تنقید میں مولانا الطاف حسین حالیؔ کے بعد ایک رومانوی رجحان کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ رومانوی رجحان دراصل سرسید احمد خاں کی ادبی تحریک کا ردِعمل تھا۔ جس میں افادیت کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ حالیؔ نے اس افادی رجحان کی ترجمانی کرتے ہوئے کلامِ غالب پر تنقید کی تھی۔ لیکن اس کے بعد تنقید میں بعض ایسے لوگ آ گئے جنہوں نے افادی رجحان کی بجائے تنقید کے رومانوی رجحان کی طرف توجہ دی اور غالبؔ کا تنقیدی مطالعہ بھی اسی تناظر میں کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا نام سرِفہرست ہے۔ وہ اس رجحان کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اور ان کی کتاب ''محاسنِ کلام غالب'' اس تنقیدی نقطہء نظر کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ اس کتاب کے مندرجات پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> بجنوریؔ درحقیقت اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کا کلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی بے شمار چھپی ہوئی حقیقتوں کی نقاب کشائی اس کا خاص میدان ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالبؔ کا مقابلہ المانوی شاعر گویٹے سے کیا ہے.....اور لکھا ہے کہ غالب اور گویٹے دونوں

کی حیثیت انسانی تصور کی آخری حدود کا پتا دیتی ہے۔شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہوگیا ہے۔(۷۹)

بجنوریؔ نے مطالعہء غالب کے سلسلے میں اپنی تنقید کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں' مقدس وید اور دیوانِ غالب۔لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے' جو یہاں حاضر نہیں۔کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا پوشیدہ نہیں ہے۔(۸۰)

بجنوری نے بلاشبہ اس کتاب میں غالبؔ کے شخصی اور تمام شعری پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔اس جائزے میں زیادہ زور اس بات پر ہے کہ غالب زندگی کے شاعر ہیں اور انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر فکری گہرائی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔بجنوریؔ کا مزاج چونکہ فلسفیانہ تھا اس لئے انہوں نے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ پہلوؤں کو بڑے غور سے دیکھا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے مغربی فلاسفروں اور مفکروں سے غالب کا موازنہ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

غالب کا فلسفہ پسی نوزا (Spinoza)' ہیگل (Hegel)' برکلے (Berkly) اور فشٹے (Fishte) سے ملتا ہے.....مسئلہ ارتقاء کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون (Darwin)' اسپنسر (Spencer)' رسل والس (watlace)' ہیگل (Hegel)' وائز مین (Weismann)' منڈل وغیرہ نے تقریباً ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے آزادطور پر اس کا پتا لگایا۔میری رائے یہ ہے کہ ہر عہد کی روح العصر ہوتی ہے جس کو المانی (Zeitgist) کہتے ہیں۔وہ روح القدس کی طرح حسبِ ضرورت زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے' مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقاء کو پہچانا ہے۔(۸۱)

بجنوریؔ نے ڈارون' برگساں' ہیگل' کانٹ اور بعض دوسرے مغربی فلسفیوں سے بھی غالبؔ کا مقابلہ کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مطالعے کا یہ حصہ' جس میں ان فلسفیوں سے غالب کا مقابلہ کیا گیا ہے' بڑی اہمیت رکھتا ہے۔کیونکہ اس میں وہ معلومات کا خزانہ ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ ان معلومات کو غالب کے فکر و فلسفہ کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں کہ اس کے خدوخال واضح ہوکر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔یہی بجنوری کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔لیکن ڈاکٹر گیان چند نے ''محاسنِ کلام غالب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے مغربی فلسفیوں کے غالب کے ساتھ موازنے کو بے جوڑ ربط کہا ہے۔وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

بجنوری نے غالب کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔اس سے اُردو ادب کو ایک نیا مقام ملا' لیکن انہوں نے مغربی فلسفیوں اور مفکروں کو لے کر جو تمہیدیں درج کی ہیں' ان میں اور غالب کے کلام پر تبصرے میں میل نہیں۔اس تبصرے سے مغربی مفکروں کے اقوال اور ان پر بجنوریؔ کے مشاہدات کو الگ کردیا جائے تو ''محاسنِ کلامِ غالب'' بہتر کتاب ہے۔(۸۲)

غالب پر بجنوریؔ کی یہ تحریر اوّلاً ''نسخہ حمیدیہ'' کے مقدمے کیلئے لکھی گئی تھی' بعدازاں اسے ۱۹۲۱ء میں کتابی شکل

میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ بجنوریؔ نے غالب کی شاعری کے انسانی اور تہذیبی پہلوؤں پر خاص طور پر توجہ کی ہے۔ اور ان کی شاعری میں ایسی صحت مند قدروں کو تلاش کیا ہے جو فرد اور معاشرہ، دونوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں ے غالبؔ کے تصوف کو اپنے پیش نظر رکھا ہے، اس کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے اور یہ نتائج نکالے ہیں کہ غالبؔ کی تصوف سے دلچسپی درحقیقت انسانی زندگی کو سمجھنے اور اس کو برتنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ یہاں بھی بجنوری نے غالب کو ایک فلسفی ثابت کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> خالق غالب کے دل کا ایک آئینہ ہے، جس میں مظہر الٰہی اور مناظرِ قدرت کا جلوہ موجود ہے۔ اس کی زبان ترجمانِ حقیقت ہے۔ اس کے پرکارِ تخیل کا دائرہ امکان سے ہم کنار ہے۔ عالمِ کون وفساد میں ایک ذرے کی جنبش بھی اس کے حلقۂ غور سے باہر ہے۔ غالبؔ فلسفی ہیں جو شاعری کا جامہ زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ (۸۳)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، بجنوری کا مزاج تنقید کی رومانیت پسندی کی طرف مائل تھا۔ چنانچہ اس رومانیت پسندی نے غالبؔ کی شاعری اور شخصیت کے بعض نئے گوشے ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کیے ہیں۔ ایسا اس لئے ممکن ہوا کہ غالب میں خود بھی ایک حد تک رومانوی شاعر چھپا بیٹھا تھا جسے سمجھنے کے لئے ایک رومانوی مزاج نقاد کی ضرورت تھی۔ بجنوری کا تخیل کلام غالب کے بعض بالکل نئے پہلوؤں تک پہنچتا ہے اور اس نے بعض ایسے نکتوں تک رسائی حاصل کی ہے، جن تک کسی اور نقاد کا پہنچنا شاید مشکل تھا۔ مثلاً ایک جگہ غالب کے بارے میں ایک پتے کی بات انہوں نے کہی ہے کہ غالب کو مناظرِ فطرت سے کہیں زیادہ شہروں کے پرشور ہنگاموں سے لگاؤ تھا۔ لکھتے ہیں:

> غالب کے مشاہدات کنارِ دریا، دامنِ کوہ، لبِ جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لبِ دریا، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے۔ جہاں زندگی شعاعِ منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ (۸۴)

اس ضمن میں بجنوریؔ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالب ایک تہذیبی روایت کی پیداوار تھے اور یہ تہذیبی روایت شہر کے ایوانوں اور شبستانوں ہی میں جلوہ نما نظر آتی ہے۔ غالب نے اس کی صحیح مصوری کی ہے۔

اس زمانے میں پہلے حالیؔ اور پھر بجنوریؔ نے غالبؔ کے تنقیدی مطالعے کا ایک اچھوتا ماحول پیدا کر دیا جس کے نتیجے میں غالب کی شخصیت اور شاعری کو مختلف پہلوؤں سے سمجھنے کی ایک فضا پیدا ہوئی۔ یعنی غالب کے تنقیدی مطالعے کی طرف جیسی توجہ ہونی چاہیے تھی، وہ ان کے اپنے زمانے میں نہیں کی گئی تھی۔ اس خلا کو حالیؔ اور بجنوریؔ نے پر کیا۔ لیکن ان دونوں نقادوں نے جس انداز میں غالبؔ کی شخصیت اور شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا اس کا ردِ عمل بھی ہوا۔ اور بعض مغربی تعلیم یافتہ ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے مغربی اصولِ تنقید کی روشنی میں ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللطیف کا نام سرِ فہرست ہے۔ غالب پر ان کی مختصر سی کتاب ''غالب'' کے عنوان سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب پہلے انگریزی میں اور پھر بہت جلد اُردو میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر لطیف نے اپنی کتاب میں

حالؔی اور بجنوریؔ کی تنقید کا ذکر کر کے مطالعہء غالب کی طرف توجہ کی ہے اس سلسلے میں انہوں نے کلامِ غالب کے تاریخی پس منظر، غالب کے مطالعے کے بنیادی مسائل، غالب کے نظریہء حیات، غالب کی شاعرانہ عظمت اور غالب کی شاعری کے ایسے ہی کچھ اور اہم موضوعات کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر لطیف نے غالب کی نجی زندگی، ان کے معاشرتی اور تہذیبی ماحول اور اس زمانے کے مختلف حالات و واقعات کو خاص طور پر اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس طرح ان کا یہ تنقیدی جائزہ سماجی اور عمرانی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف نے کلامِ غالب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی نگاہ میں پہلے دو حصوں میں شامل غالب کا وہ کلام ہے جو یا تو محض غالب کی ذہنی مشق کا نتیجہ ہے یا پھر وہ اشعار ہیں جو ان کے ذہن کے لئے نیم محسوس تھے، لیکن جہاں تک کلامِ غالب کے تیسرے حصے کا تعلق ہے تو ڈاکٹر لطیف کے نزدیک اس حصے میں ایسے اشعار ہیں، جن میں شاعر کے تجربے مکمل ہیں اور وہ پوری طرح محسوس کر کے بعض موضوعات کو پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> تیسرے حصے کے اشعار ایسے احساسات سے بھرپور ہیں جن کو شاعر نے پوری طرح سے محسوس کیا ہے اور جن پر ایسا گہرا شخصی اثر چھایا ہوا ہے کہ شاعر ان کو کسی پر تکلف صنعت گری سے پایہ جولاں نہیں کرتا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

O

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

O

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

O

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

O

سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

O

نیند اس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہوگئیں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

O

وہ بادہء شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

O

عمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

یہی وہ کلام ہے جس پر خالص وجدانی شاعری کا اطلاق ہوسکتا ہے' کیوں کہ زبان کے قالب میں جو شاعرانہ تجربہ جھلک رہا ہے اس کو حقیقی طور پر شاعر نے محسوس کیا ہے۔ پہلے حصے کی طرح اس پر نہ تو عقلی رنگ چھایا ہوا ہے اور نہ دوسرے حصہء کلام کی طرح خیال آرائی کا رنگ غالب ہے۔ (۸۵)

ڈاکٹر عبداللطیف نے کلامِ غالب کے ان تینوں پہلوؤں کو تنقیدی عمل کے سلسلے میں اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے غالبؔ کی شاعری کے فلسفیانہ پہلو پر بحث کی ہے اور بعض الفاظ کو نقل کر کے ایسے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے غالب شناسی کی روایت مستحکم ہوتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر لطیف نے جہاں غالب کی شاعری کو سراہا ہے وہاں انہوں نے کلامِ غالب پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالبؔ نے عظمت کبھی حاصل نہیں کی۔ (۸۶) بحیثیت مجموعی انہوں نے اپنی مختصر سی کتاب میں غالب اور کلامِ غالب کے بارے میں ایسی بہت سی حقیقتوں کو سامنے لا کھڑا کیا ہے جس سے ان کی دقت نظری کا ثبوت ملتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلویؔ کے خیال کے مطابق:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ڈاکٹر عبداللطیف نے جو مختصر سی کتاب غالب کے بارے میں لکھی ہے' وہ ان کی دقتِ نظر پر دلالت کرتی ہے اور اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کو سمجھنے کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے شاعروں کا جائزہ لینے کی صلاحیت ان کے اندر بدرجہء اتم موجود ہے۔ (۸۷)

مرزا غالبؔ پر جو مضامین لکھے گئے ان میں اس عہد کے ایک مضمون کا حوالہ غالب شناسی کی اہم کڑی ہے۔ یہ مضمون ''غالب کا فلسفہ'' کے عنوان سے ہے۔ جسے سید ہاشمی فرید آبادی نے رقم کیا اور یہ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے ماہنامہ ''اردو'' (اورنگ آباد) میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ مضمون کی ابتداء میں مضمون نگار نے غالب کی گھریلو زندگی اور خاندانی حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے نسخہء حمیدیہ میں سے بعض اشعار کا حوالہ دے کر غالب کے شعری فلسفے پر بحث کی ہے۔ لیکن اس بحث سے قبل ابتداً لکھتے ہیں:

یہاں ہمیں کلامِ غالب کی خصوصیات پر بحث کرنی نہیں ہے۔ بہترین اہلِ قلم یہ خدمت انجام دے چکے ہیں اور ''یادگارِ غالب'' میں اگر جس اعتقاد اور غالبؔ پرستی کے عنصر کی یا اسے مغربی شاعری سے ٹکران کی کمی رہ گئی تھی تو اسے ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے لاجواب مضمون نے پورا کر دیا ہے ہم اس موقع پر ایک مختصر تمہید کے بعد صرف ''فلسفہء غالب'' کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی غالب کے اُردو دیوان کی روز افزوں قبولیت دیکھ کر ہمیں اس بات پر غور کرنے کا خیال آیا کہ غالب کی تعلیم کیا ہے؟ اور کس قسم کے خیالات ہیں جنہیں شاعر اپنے سامعین کے دلنشیں کرنا چاہتا ہے۔ (۸۸)

سید ہاشمی نے کلامِ غالب میں سے بعض غزلوں اور قصیدوں کے اشعار نقل کیے ہیں اور انہیں غالب کے فلسفیانہ کلام قرار دیتے ہوئے انسانی زندگی کا ایک دلچسپ اور عبرت آموز خطبہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

اکثر اشعار مسائلِ زندگی پر ان کے افکار و آرا کا ایک جامہء خوشنما ہیں۔ ابتدائی کلام سے اس قسم کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

غزل نمبر ۱

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانہء آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ

غزل نمبر ۲

قطع سفر ہستی و آرام فنا ہیچ
رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

اسی طرح اس قصیدے کی تشبیب:

توڑے ہے عجز تنگ حوصلہ بر روئے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو ''جبیں''

اور یہ پورا قصیدہ:

جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بکمینِ بے زبانی

جو پہلی مرتبہ بحالت اصلی نسخہ حمیدیہ میں چھپے (صفحہ ۳۰۱، ۳۰۷) فلسفیانہ کلام کا نمونہ ہیں اور انہیں پڑھنے میں بعض وقت معلوم ہوتا ہے کہ گویا شاعر الفاظ کے راگ میں انسانی زندگی پر ایک دلچسپ و عبرت آموز خطبہ گا رہا ہے۔

یہی فلسفیت غالب کی قبولیت کا راز ہے۔ فارسی میں بلند رتبہ فلسفیانہ کلام کے بہت سے نمونے موجود ہیں لیکن ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ جن کی نگاہ سے فارسی ادب محجوب ہوتا جاتا ہے، اُردو زبان میں کلامِ غالب کو نادر و مغتنم شے پاتے ہیں۔ سوقیانہ اور فرسودہ مضامین عاشقی کی بجائے انہیں جا بجا مشرقی تغزل

کے لباس میں ایسے بلند اور حکیمانہ خیالات نظر آتے ہیں جس سے دماغ میں جودت و تازگی اور تخیل میں رفعت اور پرواز کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ (۸۹)

غالب پر تصنیف نگار نقادوں میں حالؔی، بجنوریؔ اور ڈاکٹر لطیفؔ کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی تنقیدوں سے غالب کے تنقیدی مطالعے کا ایک ماحول پیدا ہوا اور کئی اہم نقاد اُردو تنقید میں ایسے سامنے آئے جنھوں نے غالبؔ کی شاعری اور ان کے فن کے اہم پہلوؤں کو نئے تنقیدی زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ان میں شیخ محمد اکرام بطورِ خاص شامل ہیں۔ غالب پر ان کی معروف تصنیف ''غالب نامہ'' ہے جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اگرچہ مکمل طور پر تنقیدی نہیں ہے لیکن اس میں جگہ جگہ تنقید کے بعض اچھے نمونے نظر آتے ہیں۔ اکرام کا رجحان اس کتاب میں تحقیق کی طرف بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے تحقیق اور تنقید دونوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اس اندازِ تنقید سے غالبؔ کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب کا وہ حصہ جو غالب کے سوانح پر مشتمل تھا اور بعد میں الگ سے ''آثارِ غالب'' اور ''حیاتِ غالب'' کے عنوانات سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ غالب کے حالاتِ زندگی کو سمجھنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند ایک جگہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یادگارِ غالب'' کے بعد شیخ محمد اکرام کی ''آثارِ غالب'' ایسی کتاب ہے جو سوانح کی تحقیق کے لئے بھی اہم ہے اور تصانیف کی تنقید کے لئے بھی۔ اس میں بڑا توازن پایا جاتا ہے۔ اکرام نے غالب کی ادبی زندگی کے پانچ دور قرار دیے، جن میں سے تیسرا دور فارسی کا اور پانچواں دور اُردو خطوط کا ہے۔ ان تمام ادوار کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس طرح غالب کا ذہنی ارتقاء بھی سامنے آ گیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے غالب کی شاعری پر عام تبصرہ کیا، جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے اس میں غالب کی عشقیہ شاعری غالب کے فلسفے اور غالب کے مذہب پر گہری نظر ڈالی ہے۔ (۹۰)

اکرامؔ نے غالبؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے حسنِ تغزل اور عشقیہ کیفیات پر اچھی بحث کی ہے۔ وہ غالب کو نفسیاتِ محبت کا شاعر تصور کرتے ہیں۔ اور اس نفسیاتِ محبت میں جو مقامات آتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کی نجی زندگی اور ذاتی معاملات کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ اس سے ان کے بنیادی نقطۂ نظر اور اندازِ تنقید، دونوں کی وضاحت ہوئی ہے۔ دراصل وہ اس پس منظر میں غالب کی شاعری اور ان کے بنیادی خدوخال کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے سامنے بعض ایسی تصویریں آتی ہیں جو غالب کے بعض دوسرے نقادوں کے سامنے نہیں آتیں۔ مثلاً وہ غالب کے جذبۂ عشق اور حسن پرستی پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> صحت مند محبت نہ وفورِ جذبات ہے نہ فقط دل لگی، بلکہ ان میں دونوں چیزیں ہوتی ہیں، غالب کی سلیم الخیالی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان کی محبت میں دونوں اجزاء موجود ہیں۔ روایتی طرز کی رومانی شاعری بھی ہے اور محبت کو ایک سمجھنے کے حق میں جو مؤثر اظہارِ خیال انہوں نے حاتم علی مہرؔ کے خط میں کیا ہے، اس کی مثال بھی اُردو ادب میں نہیں ملتی لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کا بنیادی نقطۂ نظر رومانی تھا اور دل لگی کے مضامین

ان کے کلام میں اسی لیے آتے ہیں کہ ان کے متوازنِ تحت الشعور کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ وفورِ جذبات سے حُسنِ تناسب جاتا رہے۔ (۹۱)

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ اکرام نے غالب کی شاعری کو نفسیاتی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اکرام کا رجحان تنقید کے نفسیاتی دبستان کی طرف ہے اور انہوں نے غالب کی عشقیہ شاعری کو دیکھتے ہوئے اسی زاویہءنظر کو اپنے سامنے رکھا ہے۔

اکرام نے اس کتاب میں اُردو فارسی کے مشاہیر یعنی میرؔ، سوداؔ، مومنؔ، خسروؔ، فیضیؔ اور اقبالؔ سے غالبؔ کا موازنہ کیا ہے اور ان میں اشتراک و اختلاف کے عناصر بھی تلاش کیے ہیں۔ اسی طرح مغربی شعراء سے بھی غالب کا موازنہ کیا ہے، مثلاً ایک جگہ شیکسپئر کی نسبت لکھتے ہیں:

سر والٹر رالے نے شیکسپئر کے بارے میں لکھا ہے: ''وہ ایک نایاب ترین انسان تھا، یعنی ایک پورا انسان''۔ شیکسپئر کی نسبت تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ لیکن جن گوناں گوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا، اگر ان کا شیکسپئر کے حالات سے مقابلہ کریں تو مرزا کا پلہ شیکسپئر سے ہلکا نہیں رہے گا۔ (۹۲)

شیخ اکرام نے غالب کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں پہلا حصہ جو اکرام کے نزدیک سب سے اہم ہے وہ غالب کی جدت طرازی ہے یہ وہ خصوصیت ہے جس کے پیشِ نظر غالب تمام اُردو شعراء میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ وہ کلامِ غالب کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کلامِ غالب تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہوسکتا ہے، جو رسمی طرز میں علانیہ ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں۔ یہی وہ بلند پروازیاں ہیں، جو غزل گوئی کا میدان جیتنے کی خاطر شاعر نے دکھائیں اور جن کا ذکر حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں کیا ہے۔ یہاں شاعر غزل گوئی کے وہی پرانے ڈگر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی پھبتیاں اڑانے میں مصروف ہے، تو کبھی عاشق کی روپ میں جلوہ گر ہے، کبھی صوفی بنتا ہے اور کبھی فلسفی۔ غرض کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ لیکن چونکہ وہ جدت طرازی پر تلا ہوا ہے اس لئے اپنے ہر رسمی پہلوئے سخن پر عقلی قبا اوڑھا دیتا ہے۔ (۹۳)

''غالب نامہ''، شیخ اکرام کی جامع کتاب ہے جو آگے چل کر تین کتابوں میں تقسیم ہوکر الگ الگ عنوانات سے شائع ہوئی اس سلسلے میں خود ان کا بیان ہے:

ہماری سعی کا ماحصل تین گلدستوں میں مرتب ہوا ہے۔ ایک جو اصل چیز ہے، غالب کے اُردو فارسی کلام کا انتخاب ہے۔ تاریخی ترتیب سے یہ ''ارمغانِ غالب'' کے نام سے ہدیہءارباب ذوق ہوا تھا۔ دوسری پیش نظر کتاب ہے ''حیاتِ غالب''۔ تیسرا حصہ تنقیدی ہے جس میں اس مرتبہ طویل اضافے کیے گئے ہیں۔ اور غالب کے فلسفہ اور ''دیدودانش'' پر زیادہ توجہ کی بناء پر اسے ''حکیم فرزانہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ تینوں کتابوں کا مجموعہ ''غالب نامہ'' ہے۔ (۹۴)

بحیثیت مجموعی، شیخ اکرام نے غالبؔ پر بہت اچھا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ جو تنقیدی خیالات غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ظاہر کیے ہیں، وہ مطالعہء غالب کے سلسلے میں بعض نئے راستوں کو بناتے اور نئی منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

شیخ اکرام کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں ایسے اہل قلم نے بھی غالب پر تنقیدی نوعیت کے مضامین لکھے تھے جن کا میدان بنیادی طور پر تنقید ہی تھا۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر حمید احمد خان، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر احتشام حسین، خورشید الاسلام، ممتاز حسین، محمد حسن اور آفتاب احمد خان کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان لکھنے والوں نے اپنے اپنے زاویہءنظر سے غالب کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن مجموعہ طور پر ان سب نے غالب کے تنقیدی مطالعے کو بہت آگے بڑھایا ہے اور اس میں نئے امکانات کو تلاش کیا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیق نے غالب پر کئی ایک مضامین قلمبند کئے ہیں۔ جن میں ان کا مخصوص تنقیدی اسلوب ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ رشید صاحب کے ہاں تنقید کے تاثراتی، تاریخی اور تہذیبی رجحانات کا ایک نہایت ہی حسین امتزاج موجود ہے۔ غالب کے مطالعے میں بھی ان کا یہی انداز تنقید اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا ہے تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا۔ غالبؔ، اُردو اور تاج محل۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پاسکتے تھے۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں۔ (۹۵)

رشید احمد صدیقی کے اس بیان میں تاثراتی انداز بھی ہے اور تاریخی اور تہذیبی شعور بھی۔ انہوں نے اپنے ان چند جملوں میں غالبؔ کو ایک تہذیب کا ترجمان اور ایک تہذیب کی جمالیاتی اقدار کا عکاس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مخصوص تنقیدی اسلوب سے اس کو پوری طرح ثابت کر دکھایا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے اگرچہ غالب پر کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا ہے اس سے ان کی غالب شناسی کا حق ادا ہوتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے مطابق رشید احمد صدیقی کا نام غالبؔ کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے جیسے سورج کے ساتھ اس کی تمازت اور روشنی۔ (۹۶) ..... مئی ۱۹۵۵ء میں آل انڈیا ریڈیو سے غالب کی انشا پردازی پر ان کا ایک مضمون نشر ہوا جس میں کہتے ہیں:

> غالب کی نثری تحریریں دو طرح کی ہیں ایک مرصع و مقفیٰ جس میں انہوں نے تقریظیں لکھی ہیں۔ یہ بہت کم ہیں۔ دوسری فطری، پرخلوص، شائستہ اور شگفتہ جس میں انہوں نے خطوط لکھے ہیں۔ پہلی قسم کے اعتبار سے وہ صاحبِ طرز نہیں ہیں، دوسری کے اعتبار سے یقیناً ہیں۔ پہلی میں انہوں نے رسم پوری کی ہے۔ دوسری میں حق ادا کیا ہے، فن کا، زندگی کا، اپنا، ہم سب کا۔ (۹۷)

اسی طرح غالب کی طنز و ظرافت کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اُردو شعر و ادب ہی نہیں بلکہ طنز و ظرافت کی

محفل میں بھی غالبؔ اس طرح داخل ہوئے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے کا کوئی استاد وارد ہو جائے (۹۸)۔

رشید احمد صدیقی کی کتاب ''غزل' غالب اور حسرت'' کا ذکر یہاں اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ یہ کتاب جہاں صدیقی صاحب کے اردو غزل کے اساسی خدوخال اور تہذیبی تشخص کا مرقع ہے وہاں غالب شناسی کی روایت میں ایک اہم اور مستحکم قدم کی نشاندہی ہے۔ کتاب تین مفصل مضامین (۱) جدید غزل (۲) غالب کی شاعری (۳) حسرت اور ان کی شاعری' پر مشتمل ہے۔ دوسرے مضمون میں غالب کے شخصی' نفسیاتی اور فنی خصائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے اس بیان سے ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے:

> غالبؔ پر سوچیے تو ان کا کلام اور ان کے کلام پر غور کیجئے تو غالب بن بلائے سامنے آ جاتے ہیں۔ اچھے شاعر اور ان کے کلام کا حال کچھ اس طرح ہوتا ہے لیکن یہ میرے طرزِ فکر کا بھی قصور ہو سکتا ہے۔ جس طرح پیکر تراشی شعراء کا بہت بڑا ہنر ہے اس طرح شاعری میں شخص کو تلاش کرنا میری بڑی کمزوری ہے اسے آپ معاف فرمائیں یا نہیں مجھے معذور ضرور سمجھیں۔ (۹۹)

مندرجہ بالا اقتباس میں صدیقی صاحب نے جس بات کو اپنی معذوری قرار دیا ہے وہی تو اصل کلید ہے غالب کی شاعری کے ایوان میں داخل ہونے کی۔ گویا یہ بھی انہوں نے طنز کیا ہے ان نقادوں پر جو غالب کو صرف اس کی تراکیب اور تلمیحات میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ صدیقی صاحب نے غالب کی شاعری کو ان کی شخصیت کے بے بہا اور گوناگوں پہلوؤں کے حوالے سے دریافت کرنے کو اصل معیار قرار دیا ہے۔ اس طرح غالب محض ایک شخص نہیں رہتا بلکہ ایک پوری تہذیب بن جاتا ہے۔ صدیقی صاحب کے نزدیک کلامِ غالب کی وسعتوں اور متنوع جہتوں سے روشناس ہونے کا یہی معتبر ذریعہ ہے۔ جس کی بدولت قارئین کو غالب کی حیثیت ایک جیتے جاگتے استعارے جیسی لگتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے ساتھ ساتھ پروفیسر آل احمد سرورؔ کا ذکر بھی غالب شناسی کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہوگا۔ اگرچہ سرور پر رشید کے اسلوب اور اندازِ تنقید دونوں کے اثرات موجود ہیں' لیکن سرور کے ہاں زیادہ باقاعدگی اور غالبیات میں زیادہ گہرائی کا پتا چلتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اردو کے ایک ایسے نقاد ہیں جو تنقید میں رعنائی پیدا کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ غالب پر جو تنقید انہوں نے لکھی ہے اس میں بھی اس رعنائی' کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

غالب پر سرورؔ کی مرتبہ دو کتابیں' ''عرفانِ غالب'' اور ''عکس غالب'' ۱۹۷۳ء میں مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ کی جانب سے شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۱ء میں انہیں صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں ''مودی غالب انعام برائے اردو نثر'' مل چکا ہے۔ انہوں نے غالب کے کچھ اشعار کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے۔

غالب پر سرور صاحب کا پہلا مضمون ۱۹۴۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں کم وبیش ۳۱ مضامین مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں ''غالب کی عظمت''، ''جدید غزل گو غالب''، ''غالب کا ذہنی ارتقاء''، ''غالب کی شخصیت''، ''ظرافت اور غالب''، ''غالب اور جدید ذہن''، ,,,غالب کا تنقیدی شعور'' اور ''غالب کی شاعری کی معنویت''

قابلِ ذکر ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون میں غالب کی اردو، فارسی نظم ونثر کے بارے میں مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> غالب نے اردو شاعری کو نیا رنگ وآہنگ دیا۔ مگر اردو نثر کو انہوں نے ایک معنی میں نئی زندگی دی۔ غالب اگرچہ فارسی شاعری کو اپنی اردو شاعری سے اور فارسی نثر کو اردو نثر سے بہتر کہتے رہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو اردو نثر کی اہمیت فارسی نثر سے زیادہ ہے۔ فارسی میں وہ ایک صاحبِ طرزِ انشاء پرداز اور کہنہ مشق استاد ہیں۔ مگر اردو میں وہ جدید نثر کے بانی اور مکتوب نویسی کے رہنما ہیں۔ غالب کی انفرادیت خطوں میں نئی شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کی سادگی، بے ساختگی، دلچسپی اور ظرافت پر بھی زور دیا جاتا رہا ہے مگر سب سے زیادہ اہم ان خطوط کی بیباک صداقت ہے۔ (۱۰۰)

اس اقتباس سے سرورؔ صاحب کے اندازِ تنقید کی پوری طرح وضاحت ہوجاتی ہے۔ ان کی تنقید میں تجزیے کا عنصر غالب ہے اور تجزیہ کرتے ہوئے ان کی نظر ان عوامل اور محرکات کی تہہ تک پہنچتی ہے، جو غالب کی شخصیت اور شاعری کو بنانے میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ سرور کی تنقید میں کہیں کہیں تحقیق کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اس خصوصیت کے باعث ان کا تنقیدی شعور حق وصداقت کی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں غالب کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> غالب کے ہاں تخیل کی بے اعتدالیاں شروع سے ملتی ہیں۔ مگر جلد وہ ان سے خبردار ہوجاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے آخر دس سال میں شعر بہت کم کہے۔ ان کی شاعری کا چشمہ خشک ہونے لگا تو وہ اس رمز سے آگاہ ہوگئے کہ دنیا میں کوئی چیز اتنی مضحکہ خیز نہیں جتنی بڑھاپے کی غزلیں، ڈرائڈن کی طرح غالبؔ نے بھی آخر عمر میں نثر کی طرف زیادہ توجہ کی اور شعری پیکروں کے بجائے مرقع نگاری کی، غالب کے ان سادہ نقوش میں نثر کی روشنی اور وضاحت ہے مگر شعر کی دل نشیں اور تاثیر بھی، ان کی ظرافت نے ان کے پھوڑے پھنسیوں کو بھی ''سرو چراغاں'' بنا دیا۔ (۱۰۱)

سرورؔ کی مرتبہ دو کتابوں ''عرفان غالب'' اور ''عکس غالب'' میں اوّل الذکر مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے جبکہ ''عکسِ غالب''، منتخب خطوطِ غالب کا مجموعہ ہے۔ یہ انتخاب ۱۹۷۳ء میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ ایک ایسا انتخاب ہے جس سے نہ صرف غالب کی شخصیت اور ان کی شاعری کا بلکہ ان کے آس پاس کے ماحول اور ان کے مشاغل کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں سرور نے لکھا ہے:

> اس مجموعے میں نوادر پر توجہ نہیں ہے بلکہ خطوط کی ادبی اہمیت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ادبی اہمیت میں بھی ''ادبی خطوط'' مرتبہ عسکری کی خالص فنی بحثوں کے بجائے غالب کی باغ وبہار نثر اور مراسلے میں مکالمے کی شان پیش نظر رہی ہے۔ (۱۰۲)

سرور نے ''عکس غالب'' میں ۳۹ افراد کے نام غالب کے ۱۵۶ خطوط شامل کیے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کے مرتبہ ''خطوط غالب'' (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) کو بنیاد بنا کر انہوں نے ایک گوشوارہ تیار کیا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس

مکتوب الیہ کے نام غالب کے موجود کل کتنے خطوط میں سے انہوں نے کتنے خط منتخب کئے ہیں۔نمونہ اس طرح ہے:

مکتوب الیہ	'عکس غالب' انتخاب	خطوں کی تعداد
۱۔نواب امین الدین احمد خاں	۲	۷
۲۔علاؤالدین احمد خاں علائی	۱۰	۵۷
۳۔نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر	۱	۱
۴۔مرزا شہاب الدین خاں ثاقب	۲	۱۰
۵۔قربان علی بیگ خاں سالک	۱	۲
۶۔منشی ہرگوپال تفتہ	۲۹	۱۲۴

سرورؔ نے خطوطِ غالب کے اتنے بڑے ذخیرے میں سے صرف ڈیڑھ سو خطوط کو منتخب کیا ہے۔صرف اس لیے کہ ان کے نزدیک غالب نے اپنی شخصیت کی جس طرح نگہداشت کی اور جس طرح اندر کی شمع میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کردی اس کا مطالعہ ان کے منتخب خطوں کے ذریعے ہوتا ہے۔وہ ان خطوں کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

> غالب کے ان خطوط سے دراصل جدید نثر کا آغاز ہوتا ہے۔اگر سرسید ''آثارالصنادید'' دس سال بعد لکھتے تو انہیں اپنے مواد کو صہبائی سے مروجہ طرز میں لکھوانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ان خطوط کے اثر سے سرسید اور حالی کی سلامتی طبع کو اپنی منزل تک پہنچنے میں مدد ملی۔اردو نثر کی تاریخ میں ان خطوط کا درجہ بہت بلند ہے اور جہاں تک مکتوب نگاری کا تعلق ہے' بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ خواہ وہ شبلی ہوں یا ابوالکلام' غالب کے خطوں کا اب تک جواب نہ ہوسکا۔ (۱۰۳)

سرور کے اس انتخاب سے جہاں غالب کی شخصیت کے بے شمار گوشے منور ہوتے ہیں وہاں خود سرور کے تنقیدی اور تحقیقی شعور سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔''عکسِ غالب'' میں خطوط کا انتخاب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے بقول:

> تفہیم غالب میں ایک نئے در کو وا کرتا ہے اور غالب شناسی میں ایک مستقل قدر و قیمت کا حامل ہے۔ (۱۰۴)

اردو میں غالب کی شخصیت اور تصانیف کا جن لوگوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے ان میں مالک رام کا ذکر بھی اہمیت سے خالی نہیں۔غالبیات میں ان کے کام کو یوں گروہ بند کیا جاسکتا ہے:

(الف) تذکرہ:

۱۔ذکر غالب ۲۔فسانہء غالب ۳۔تلامذہء غالب

۴۔نیشنل بک ٹرسٹ کے لئے انگریزی میں "Miraza Ghalib"

(ب) ترتیبِ متن:

۱۔سبد چیں ۲۔دستنبو ۳۔کلیاتِ نظم غالب' فارسی ۴۔دیوانِ غالب' اردو

۵۔گل رعنا ۶۔خطوط غالب ۷۔یادگارِ غالب (اردو، فارسی)

(ج) مضامین:

مالک رام نے غالب سے متعلق ۴۰ مضامین لکھے ہیں۔ (۱۰۵)

غالبیات میں ان کا اہم کارنامہ ''ذکر غالب'' ہے۔ یہ کتاب اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ غالب کے سوانح پر واقعات کے استناد اور صحت کے معاملے میں معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب میں تین باب ہیں۔ پہلے طویل باب میں غالب کے حالات ہیں۔ دوسرے باب میں غالب کی تمام فارسی اور اردو تصانیف کی مستند تفصیلات ہیں۔ جبکہ تیسرے باب کا عنوان ''عادات و اخلاق'' ہے۔ یہ بھی بہت مفصل اور جامع ہے۔ اس کتاب کے عمومی معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند کہتے ہیں:

> غالب کی زندگی کے واقعات اور تصانیف کے بارے میں کچھ جاننا ہو تو ہم ''ذکر غالب'' پر جس قدر اعتماد کر سکتے ہی۔ اتنا کسی اور سوانح عمری غالب پر نہیں۔ (۱۰۶)

''فسانہء غالب'' مالک رام کی دوسری اہم کتاب ہے جس میں ان کے ۱۵ مضامین شامل ہیں۔ یہ سارے مضامین بھی غالب کے سوانح سے متعلق ہیں۔ پہلا مضمون ''توقیتِ غالب'' کے عنوان سے ہے، جو اس سے قبل ''ادبی دنیا'' لاہور، جولائی ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ مجموعے کے چار مضامین ان اشخاص کے بارے میں ہیں جن کا غالب کی زندگی کے ساتھ گہرا ربط تھا۔ ان میں سے پہلا مضمون ان کے بھائی مرزا یوسف کے بارے میں ہے۔ دوسرا مضمون نواب شمس الدین احمد خاں کے بارے میں ہے۔ تیسرا مضمون قتیل سے متعلق اور چوتھا عبدالصمد سے متعلق ہے۔ یہ چاروں شخصی مضامین دراصل سوانحِ غالب کا ایک اہم باب ہیں۔

اسی طرح ''فسانہء غالب'' کا ایک مضمون ''غالب کی مہریں'' ہے۔ اس میں غالب کے چھ مہروں کی تفصیل اور عکس دیا گیا ہے۔ ایک مضمون کا عنوان ہے ''مقدمہء پنشن کا عرضی دعویٰ'' اس میں غالب کے عرضی دعویٰ کی طویل داستان ہے اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ۲۰ دفعات پر مشتمل دعوے کے دستاویزی ثبوت فراہم کئے گئے ہیں۔ دو مضامین سکے کے الزام سے متعلق ہیں۔ ان میں دوسرا مضمون ''غالب سے منسوب دوسرا سکہ'' زیادہ اہم اور دلچسپ ہے۔ قصہ مختصر اس کتاب کو مالک رام کی پہلی کتاب ''ذکر غالب'' کا تتمہ کہا جاتا ہے۔

''تلامذہء غالب'' مالک رام کی تیسری اہم تصنیف ہے جو غالب کے شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک خط مرقومہ ۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء بنام مختار الدین احمد آرزو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خط میں مالک رام انہیں لکھتے ہیں:

> میں نے پارسال (۱۹۴۸ء) میں تلامذہء غالب کا تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ یہاں میرے پاس کتابیں کہاں کہ ان سے استفادہ کر سکتا۔ ناچار آپ کی خدمت میں لکھا۔ جو ذخیرہ یہاں موجود تھا اس کو مرتب کیا اور پچاس ساٹھ صفحے لکھ ڈالے۔ یہ کام کب کا ختم ہو گیا ہوتا' اگر آپ جلد میری درخواست پر تذکرے مہیا

کر دیتے، لیکن چند دن ہوئے آفاق صاحب کی شائع کردہ کتاب ''نادرات غالب'' کراچی سے موصول ہوئی.....اب سوال یہ ہے کہ کیا مجھے اپنا تذکرہ مکمل کر کے شائع کرنا چاہیئے یا اس کام سے ہاتھ اُٹھالوں۔ (۱۰۷)

لیکن مالک رام نے اپنا کام جاری رکھا اور ''تلامذہ غالب'' کی شکل میں جو تذکرہ سامنے آیا اس میں انہوں نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا۔ جب ہم آفاق حسین آفاق دہلوی کی غالب کے شاگردوں پر کتاب ''نادرات غالب'' کو دیکھتے ہیں تو واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ آفاق نے غالبؔ کے ۹۳ شاگردوں کا ذکر کیا ہے جبکہ مالک رام نے ۱۸۱ نام گنوائے ہیں۔ اس طرح مالک رام کے ہاں صداقت کی تلاش کا رویہ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ ''تلامذہء غالب'' غالب کے شاگردوں کے بارے میں اپنی طرز کا واحد تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے مطابق:

> محقق شہیر مالک رام ایم اے نے غالب کے شاگردوں کے حالات پر نہایت محنت اور تحقیق سے ایک جامع کتاب ''تلامذہء غالب'' لکھی ہے۔ اسی کتاب میں غالب کے شاگردوں کے اسماء اور حالات شامل ہیں۔ جن لوگوں کے حالات نہیں مل سکے ان کے صرف نام لکھنے ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی اس سلسلے میں کام کی گنجائش ہے۔ (۱۰۸)

کام کی گنجائش واقعی تھی، مالک رام نے طبع اوّل میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں مزید پینتیس (۳۵) لوگوں کے نام اضافہ ہوئے۔ اسی طرح سے پہلے ایڈیشن میں انہوں نے غالب کے ۲۷ شاگردوں کی تصاویر شامل کیں۔ دوسرے ایڈیشن میں تصاویر کی یہ تعداد تینتیس (۳۳) ہوگئی۔ مختصر یہ کہ ''تلامذہ غالب'' مالک رام کی ایک نادر تحقیقی کاوش ہے۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن کے ایک بیان کے مطابق:

> تلامذہ غالب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ آفاق دہلوی کی کتاب ''نادرات غالب'' کے بعد غالب کے شاگردوں کے بارے میں یہ واحد مکمل کتاب ہے، جس سے نہ صرف مطالعہء غالب کے سلسلے میں پڑھنے والوں کی رہنمائی ہوسکتی ہے بلکہ خود یہ ۱۸۱ شاگرد فرداً فرداً تاریخ ادب اردو کا حصہ بن گئے ہیں.....ان ۱۸۱ تلامذہ میں بہت سے نقش ونگار طاق نسیاں ہو چکے تھے لیکن مالک رام کی تلاش وتحقیق کی بدولت وہ پھر زندہ ہوکر سامنے آ گئے ہیں۔ (۱۰۹)

غالب کی تصانیف کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں مالک رام نے جو اصول اپنایا ہے وہ نہ صرف محققانہ ہے بلکہ حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ترتیب متن کے لیے ایک ہی متن کے مختلف نسخوں میں سے ایک نسخے کو اساسی قرار دیا اور اسے کتاب کے متن میں درج کر دیا۔ بقیہ نسخوں کے متون کو اختلافِ نسخ میں شامل کر دیا۔ ان کے مطابق اس سے یہ بداہتاً معلوم ہو جائے گا کہ اساسی نسخے کا متن ناقص ہے یا کسی دوسرے کا۔ (۱۱۰)

مالک رام نے ''غالب'' پر جو وقتاً فوقتاً جو مضامین قلم بند کئے ان میں بعض مضامین ایسے نادر اور عمدہ ہیں جن

سے مالک رام کے غالب شناس ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ان میں سے چند ایک مضامین کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ ''غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر''۔(۱۱۱)

غالبؔ نے دہلی سوسائٹی میں ایک مضمون پڑھا تھا' جو کسی مجموعے میں شامل نہیں تھا۔اس کا متن اس مضمون میں شائع کیا گیا ہے۔

۲۔ ''نادر خطوط غالب پر ایک نظر''۔(۱۱۲)

۱۹۴۰ء میں رسؔا گیاوی نے ''نادر خطوط غالب'' کے نام سے غالب کے مبینہ خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ سب سے پہلے مالک رام نے مذکورہ مضمون میں ثابت کیا ہے کہ یہ مجموعہ جعلی ہے۔

۳۔ ''قادر نامہ کا مصنف''(۱۱۳)

مولانا غلام رسول مہر نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ ''قادر نامہ'' غالب کی تصنیف نہیں ہے۔لیکن مالک رام نے ثابت کیا ہے کہ یہ غالبؔ ہی کی تصنیف ہے۔

۴۔ ''سوالاتِ عبدالکریم''(۱۱۴)

مالک رام کا خیال ہے کہ یہ رسالہ غالب کی تصنیف ہے۔ان کے دلائل کے بعد اسے عام طور پر سے غالب کی تصنیف مانا جانے لگا ہے۔

۵۔ ''غالب کے فارسی قصیدے''(۱۱۵)

غالب نے اپنے فارسی قصیدوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کی تھیں' اور ایک ممدوح کا نام نکال کر دوسرے کا داخل کر دیا۔اس مضمون میں اسی الٹ پھیر کی تفصیل درج ہے۔

۶۔ ''دستنبو''(۱۱۶)

اس میں ان واقعات کا ذکر ہے جن میں غالب نے دانستہ طور پر ردوبدل کیا ہے۔

۷۔ ''میرزا غالب''(۱۱۷)

یہ مالک رام کا تحریر کردہ مرزا غالب کا خاکہ ہے۔جو ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ خاکہ بہت دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔اس کی

خاص بات یہ ہے کہ اس میں خود کو غالب کا ہم عصر' بلکہ ان کا عزیز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

غالبیات کے ضمن میں مالک رام کا کام معتبر بھی ہے اور وقیع بھی۔ان کے کام کا مجموعی جائزہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند کی رائے سے اتفاق کرنا ہوگا۔وہ لکھتے ہیں:

غالبیات کے باب میں مالک رام صاحب کے وسیع کاموں میں ''ذکر غالب'' اور ''فسانہ غالب'' چوٹی پر

ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے گلِ رعنا بھی بلند ہے۔ لیکن ''دیوانِ غالب'' نسبتاً ہلکا کام ہے اور ''خطوط غالب'' ادھوری ترتیب۔ یہ بات نہیں کہ مالک رام ترتیبِ متن میں کسی سے کم تر ہیں۔ انہوں نے ''کربل کتھا'' کی بےنظیر ترتیب کی۔ ابوالکلام آزاد کے ''تذکرہ'' اور ''غبارِ خاطر'' کی ترتیب اتنی عالمانہ ہے کہ انہیں دیکھ کر ہوش اُڑتے ہیں۔ ترتیبِ متن کے یہ مثالی کام ہیں۔ ''دیوانِ غالب'' کی ترتیب اس معیار کی اس لئے نہیں کہ انہوں نے اسے ''نسخہء عرشی'' کی طرح تحقیق کا شاہکار بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بہرحال غالبیات کے میدان میں مالک رام کا تنوع قابل داد ہے۔ ان کے مرتبے اور ان کی نظر کا اعتراف نہ کرنا ان کے ساتھ ہی نہیں، علم وادب کے ساتھ بھی ناانصافی کرنا ہے۔ (۱۱۸)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ذکر یہاں اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ غالب پر ان کی دو کتابیں ''فلسفہء کلام غالب' اور ''غالب۔فکر وفن'' غالب شناسی کا مستند حوالہ ہیں۔ اگرچہ یہ کتابیں قیام پاکستان کے بعد شائع ہوئیں لیکن ڈاکٹر سبزواریؔ نے تقسیم سے پہلے غالب پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک تحقیق کے مطابق ان کی کتاب ''فلسفہ کلام غالب'' جو دوسری مرتبہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی، دراصل ۴۰۔۱۹۳۹ء کے قریب لکھی گئی۔ (۱۱۹)

اس کتاب میں کلام غالب کا مطالعہ وتجزیہ ایک نئے زاویے سے کیا گیا ہے۔ خاص کر اس میں نصرانیت اور اسلام کی تعلیم کے تمام پہلو پیش کیے گئے ہیں اور اسی تناظر میں غالب کو ایک فلسفی شاعر کہا گیا ہے۔ (۱۲۰)

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں غالب کی فلسفیانہ فکر پر جامع انداز میں بحث کی گئی ہے۔ جبکہ آخری حصے میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ شوکت سبزواری نے میر پر غالب کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح سے غالبؔ کی فکر کے سلسلے میں ایک بحث کہ غالب ''رجائی ہے یا قنوطی'' ڈاکٹر شوکت نے اپنے جامع رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس بحث کا آغاز ڈاکٹر عبداللطیف کے اس بیان سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے غالب کے اس پہلو کو یہ کہہ کر ہدفِ اعتراض بنایا تھا:

> غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو عطائے رحمانی کا شکر گزار تھا اور نہ انسانی خدمات کا۔ (۱۲۱)

اس کے برعکس نیاز فتح پوری نے لکھا ہے:

> غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا تو وہ فلسفہ تفاول ومسرت تھا۔ (۱۲۲)

شیخ اکرام اس نقطہء نظر سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم وحزن کی جھلک مسرت واطمینان سے زیادہ نمایاں ہے۔ (۱۲۳)

جبکہ اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر شوکت سبزواری کا فیصلہ ہے کہ:

> غالب دراصل نہ قنوطی ہیں نہ رجائی، ارتقائی ہیں، یعنی زندگی میں روز وشب کی طرح شادی وغم میں بھی

گزراں ہیں اس لئے غالب کو قنوطی نہیں کہا جا سکتا۔ (۱۲۴)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی دوسری کتاب ''غالب، فکر و فن'' ہے۔ یہ ان کے چند مقالات کا مجموعہ ہے جن میں کسی نہ کسی پہلو سے غالب کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مجموعے کے پہلے دو مقالات میں فکرِ غالب کی نقاب کشائی کی گئی ہے جبکہ آخر کے دو مقالے اس ساری بحث کا حاصل ہیں۔ وہ غالب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن پھر بھی کم ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے بہت سے گوشے اب بھی تاریکی میں ہیں اور اچھی طرح روشن نہیں ہوئے ہیں۔ ہر بڑے شاعر کی شخصیت اس کے کلام میں جھلکتی ہے۔ بڑے شاعر چھوٹے شاعر دراصل شاعر نہیں نقال ہیں۔ صدا اور گونج ہیں..... بڑا شاعر اپنی فطرت سے شاعر ہوتا ہے۔ اس کا کلام اس کی فطرت کا پَرتو ہوتا ہے..... غالب بڑا شاعر تھا۔ اس لئے اس کی شخصیت کا پَرتو ہمیں اس کے کلام میں نظر آنا چاہیئے۔ شخصیت کی تعمیر میں مزاج اور ذہن کا عمل ہے۔ ان میں دونوں کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ (۱۲۵)

ڈاکٹر سبزواری آگے چل کر غالب کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کسی نے اورنگ زیب سے شکایت کی کہ خان فیروز جنگ اپنی مثل کسی کو نہیں سمجھتے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا: ''یوں کہو کہ اپنی مثل کسی کو نہیں دیکھتے''۔ غالب کو بھی فیروز جنگ کی طرح اپنا ہمسر نظر نہیں آتا۔ غالب کے فن میں ایک انفرادی شان ہے۔ ان کے شعر میں جدت ہے۔ ان کے اندازِ فکر میں انوکھا پن ہے۔ ان کی طرزِ ادا میں جدت ہے۔ یہ سب کچھ ان کی خود پسند طبیعت کے کرشمے ہیں۔ وہ پامال راہ پر چلنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ان کی زبان، ان کا بیان، ان کی تشبیہیں، ان کے استعارے، ان سب میں ایک نئی کیفیت، ایک نیا جوش، ایک نئی آن ہے۔ وہ ہر بات میں جدت کے شیدائی ہیں۔ ہر صنف میں انہوں نے نئی راہ نکالی ہے۔ (۱۲۶)

مختصر یہ کہ ڈاکٹر سبزواری کا غالب پر کام خالصتاً تنقیدی نوعیت کا ہے جس سے غالب شناسی کی روایت مستحکم خطوط پر استوار ہونے لگی۔

نظامی پریس بدایوان کے مالک اور اخبار ''ذوالقرنین'' (بدایوان) کے مدیر مولوی نظام الدین حسین، نظامی بدایوان کا ذکر یہاں اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ وہ نہ صرف غالب شناس تھے بلکہ انہوں نے غالب کے دیوان کی اشاعت اور اپنے اخبار ''ذوالقرنین'' میں غالب کے کلام اور ان سے متعلق مضامین کی اشاعت میں جو خدمات سرانجام دیں وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ دیوانِ غالب کا نظامی ایڈیشن جو پانچ مختلف اشاعتوں (۱۲۷) کے ذریعے منظرِ عام پر آیا، نظامی بدایوانی کی گراں قدر کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کی ایک اشاعت کے مقدمہ میں وزیر تعلیم صوبہ بہار، ڈاکٹر سید محمود رقمطراز ہیں:

> سر راس مسعود کی تحریک پر مولانا نظامی بدایونی نے دیوانِ غالب کا پہلا ایڈیشن نفیس کاغذ اور صاف ستھری

چھپائی کے ساتھ ملک میں پہلی بار پیش کیا۔ دوسرے ایڈیشن اور زیادہ عمدگی اور صحت کے ساتھ نکلا' پتا چلا کہ اہل ملک غالب کی عظمت کو پہچانتے اور اس ترجمان حقیقت کے فلسفیانہ خیالات کو سمجھنے لگے ہیں۔ ان دونوں اشاعتوں کے بعد اس ہیچ میرز نے نظامی صاحب کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے تحریک کی اب تیسرا ایڈیشن پاکٹ ایڈیشن کی صورت میں ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی اور تجاویز پیش کیں۔ مولانا نظامی نے میری تجویز کو منظور کر لیا لیکن اس کے قصور کے ساتھ ہی میری سزا بھی تجویز کر دی کہ مجھ سے فرمائش کی کہ تیسرے ایڈیشن کا مقدمہ تم لکھو۔ (۱۲۸)

نظامی بدایوانی کے معیارِ طباعت پر تبصرہ کرتے ہوئے امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

نظامی بدایونی نے دیوانِ غالب سادہ اور باشرح کے متعدد بہترین نسخے شائع فرما کر ملک پر بہت بڑا ادبی احسان کیا تھا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے غالب کے اردو دیوان کے فارسی دیباچہ کی تاریخ ایک رام پوری نسخے کی مدد سے (جو احمد علی شوق قدوائی مرحوم کے پاس تھا) ۱۲۴۸ھ متعین کی نیز نامی پریس کانپور کے بعد حسنِ طباعت کا جو اعلیٰ معیار آپ نے قائم کیا تھا وہ آج بھی قابل داد و ستائش ہے۔ (۱۲۹)

دیوانِ غالب کے تیسرے ایڈیشن میں نظامؔی نے مختصر شرح بھی شائع کی جو مرزا غالب کے خطوط کی روشنی میں مرتب کی گئی' جس کی وجہ سے اس شرح میں امتیازی خصوصیت پیدا ہو گئی۔

نظامی بدایونی نے غالب کے حالاتِ زندگی پر ایک کتاب ''نکاتِ غالب'' کے عنوان سے مرتب کی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے' پہلے حصے میں غالب کی خودنوشت' دوسرے حصے میں کلامِ غالب کے ادبی نکات اور تیسرے حصے میں لطائف اور ظرائف ہیں۔ اس کتاب کا سارا مواد بقول ان کے غالب کے خطوط سے لیا گیا ہے۔ (۱۳۰)

نظامی پریس بدایون سے ایک ہفتہ وار اخبار ''ذوالقرنین'' شائع ہوتا تھا۔ یہ نہایت سنجیدہ' علمی اور تہذیبی نوعیت کا اخبار تھا۔ اس میں مرزا غالب کا کلام اور ان سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہے۔ چند ایک اہم مضامین کا اشاریہ درج ذیل ہے:

۱۔	معین الدین شاہجہان پوری'	''تربتِ غالب مظلوم مرحوم''	۲۸ جون ۱۹۱۱ء
۲۔	نظامی بدایونی'	''مرزا غالب کے مرزا کی مرمت''	۱۷ اگست ۱۹۱۶ء
۳۔	نظامی بدایونی'	,,مرزا غالب سے للّٰہی بغض''	۱۷ اکتوبر ۱۹۲۸ء
۴۔	محمد یحییٰ تنہاؔ'	''مرزا غالب کا اردو کلام''	۱۷ اکتوبر ۱۹۲۸ء
۵۔	نظامی بدایونی'	''غالب کے عیب جو اور مداح''	۲۱ اگست ۱۹۲۹ء
۶۔	مہیش پرشاد'	''حضرت غالب دہلوی کے قدر شناسوں کی خدمت میں''	۲۲ نومبر ۱۹۳۳ء
۷۔	اداریہ'	''غالب کی یادگار.....ایک مشورہ''	۷ ستمبر ۱۹۵۴ء

۸۔	وقار رضوی'	''غالب''	۱۴مارچ ۱۹۵۷ء
۹۔	اداریہ'	''غالب پر آج تک جو کچھ لکھا گیا''	۲۱ستمبر ۱۹۶۵ء
۱۰۔	مالک رام'	''غالب' شخصیت اور شاعری''	۲۱فروری ۱۹۲۹ء
۱۱۔	پروفیسر رشید احمد صدیقی'	''غالب کی شخصیت''	۲۱مارچ ۱۹۶۹ء

غالب پر کام کرنے والوں میں قاضی عبدالودود کا نام یہاں قابل ذکر ہے۔ غالب پر ان کی دیگر تحریروں کے علاوہ ان کی معروف کتاب ''مآثر غالب'' اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ یہ کتاب غالبیات ہی میں نہیں بلکہ خود قاضی صاحب کے تحقیقی کارناموں میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں غالب کی اردو فارسی نظم ونثر کی متعدد نادر و نایاب تحریروں کو یکجا کر کے ان پر عالمانہ حواشی لکھے گئے ہیں:

یہ کتاب (مآثر غالب) پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اردو بہار کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ عجلت کے باعث قاضی صاحب خود اپنے اس کام سے مطمئن نہ تھے بقول ان کے:

''مآثر غالب کی ترتیب بڑی عجلت میں ہوئی ہے۔ بعض امور کی حسبِ دل خواہ تحقیق قلت وقت کی وجہ سے نہ ہوسکی''۔ (۱۳۱)

لیکن اس کے باوجود متن کتاب کے بعد قاضی صاحب کے عالمانہ حواشی اپنی مثال آپ ہیں۔ مختار الدین احمد لکھتے ہیں:

> غالب کی تحریرات نظم ونثر کے ہر حصے کے متعلق ایسے بیش قیمت معلومات انہوں نے پیش کیے ہیں کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ان پر اضافہ مشکل نظر آتا ہے۔ (۱۳۲)

۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر حنیف نقوی نے تصحیح وترتیب نو کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ حنیف نقوی نے اس کتاب کی ترتیب میں جس دلسوزی اور عرق ریزی سے کام کیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> مجھے اپنے شاگرد حنیف نقوی کی مشقت دیکھ کر دل سوزی ہوتی ہے کہ ''مآثر غالب'' غالبیات کی ایسی کتاب پارینہ ہے جس پر بہت کم قارئین توجہ دیں گے۔ غالب کی فارسی تحریروں میں کس کو دلچسپی ہے؟ حنیف نے ایسے رسالے پر اتنی غیر معمولی دیدہ ریزی کی' اتنی کاوش سے تو وہ غالب پر ایک مستقل کتاب لکھ سکتے تھے۔ میں اس کتاب کے ایک صفحے کے بھی حواشی لکھنے کا اہل نہیں۔ حیرت ہوئی ہے کہ حنیف کو غالب سے متعلق افراد' غالب کی فارسی تحریروں اور فارسی ادبیات کا اتنا گہرا عرفان ہے۔ (۱۳۳)

''مآثر غالب'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اردو نثر' اردو نظم' فارسی نثر' فارسی نظم ہیں۔ دوسرے حصے میں غالب کے ۳۲ فارسی خطوط ہیں۔ حنیف نقوی کے مطابق اس مجموعے کا اہم ترین حصہ یہی فارسی خطوط ہیں۔ ان میں سے صرف چار خط متن کے بعض اختلافات کے ساتھ ''متفرقات غالب'' مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی میں بھی شامل ہیں۔ باقی اٹھائیس خطوط نہ تو اس سے پہلے کسی جگہ دستیاب تھے اور نہ اس کے بعد کسی دوسرے ذریعے سے سامنے آسکے ہیں۔ یہ خطوط قاضی صاحب کو ڈھاکہ کے مشہور طبیب اور مصنف شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن خاں کے کتب خانے کی

ایک بیاض سے حاصل ہوئے تھے۔ شیخ محمد اکرام کے نام قاضی عبدالودود کے ۲۵ راگست ۱۹۴۳ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط تقریباً اس زمانے میں انہیں دستیاب ہو گئے تھے۔ وہ اس سلسلے میں شیخ صاحب کو لکھتے ہیں:

> فارسی کے ۳۳ غیر مطبوعہ خطوط ابھی حال میں ملے ہیں، میرے نزدیک ایک دوست انہیں مرتب کر رہے ہیں، میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ میں چھپوا دوں گا۔ (۱۳۴)

مختصراً ''مآثر غالب'' قاضی عبدالودود کی تدوین متن کے سلسلے میں ایک اہم اور معیاری کاوش ہے جو غالبیات میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

غالب شناسی کی فہرست میں امتیاز علی عرشیؔ کا نام بھی صف اوّل کے ناقدین اور محققین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے غالب پر جو گراں قدر کام کیا ہے وہ زیادہ تر ترتیب و تدوین سے متعلق ہے۔ تاہم انہوں نے تنقید کے حوالے سے بھی غالب پر کئی ایک شذرات قلمبند کیے ہیں۔ ان کی غالب شناسی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

> ارباب علم و فضل میں بحیثیت غالب شناس مولانا امتیاز علی عرشی کا اسم گرامی سرفہرست ہے اور انہوں نے غالب شناسی کے میدان میں بلاشبہ عظیم کارنامے انجام دیے ہیں اور مسرت کی یہ بات ہے کہ ان کی سرپرستی میں یہ روایت اور آگے بڑھ رہی ہے۔ (۱۳۵)

عرشی کا غالب پر پہلا باقاعدہ کام ''مکاتیب غالب'' کی ترتیب و تدوین ہے۔ اس مجموعے میں وہ خطوط شامل ہیں جو غالب نے والیانِ ریاست رام پور نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان کو لکھتے تھے۔ یہ خطوط پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئے خطوط کی کل تعداد ۱۲۹ ہے۔ اس مجموعہء خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

> یہ خطوط ستر پچھتر برس سے کتاب خانہء رام پور میں پڑے تھے، لیکن کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اچھا ہی ہوا کہ ان کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا، ورنہ کوئی اناڑی ''ڈاکٹر'' انہیں غلط ملط چھاپ دیتا اور یوں یہ ہمیشہ کے لئے غارت ہو جاتے۔ عرشی صاحب نے انہیں زندہء جاوید کر دیا۔ پھر جس اہتمام سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے، وہ بجائے خود اردو طباعت میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ (۱۳۶)

''انتخابِ غالب'' کے نام سے عرشیؔ کا ایک اور اہم علمی کارنامہ یہاں قابل ذکر ہے۔ اس مجموعے میں غالب کے اردو اور فارسی کلام کا وہ انتخاب ہے جو انہوں نے نواب کلب علی خان کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں کیا تھا۔ امتیاز علی عرشی نے اس پر ایک پرمغز مقدمہ لکھا ہے اور مرزا غالب کی شاعری پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔ انتخاب کے آخر میں عرشی نے اختلافات نسخ ظاہر کیے ہیں ساتھ ہی ایک اشاریہ بھی مرتب کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں بقول مولوی عبدالحق:

> بعض اشعار کی شرح بھی لکھ دی ہے اور اس میں کہیں کہیں بڑے لطیف نکات بیان کیے ہیں۔ شرح کی تائید میں اکثر مرزا غالب کے بیان، ان کے رقعات وغیرہ سے نکال کر دیے ہیں۔ (۱۳۷)

''انتخاب غالب'' کا یہ نسخہ کتاب خانہ رام پور سے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا گیا۔

امتیاز علی عرشی کا غالبیات پر قابل ذکر اور گراں بہا کارنامہ ''دیوان غالب' اردو (نسخہ عرشی) کی تدوین و اشاعت ہے' ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے یہ دیوان شائع کیا۔ ''تقریب'' پروفیسر آل احمد سرور نے لکھی۔ عرشی نے ۱۲۰ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ اس نسخے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مرزا غالب کے اردو کلام کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں غالب کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مجموعہ (نسخہ عرشی) غالب کے اردو کلام کے کلیات اور انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا عرشی کی اس گراں قدر خدمت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو کے جتنے بھی شعری مجموعے مرتب کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ معیار ترتیب کے لحاظ سے ان سب میں ''نسخہ عرشی'' کو سب سے اوپر رکھا جائے گا۔ کم سے کم الفاظ میں ''نسخہ عرشی'' کی امتیازی خصوصیات یوں بیان کی جاسکتی ہیں:
>
> ۱۔ غالب کا پورا کلام یکجا کرنا۔ ۲۔ اس کی تاریخی ترتیب۔
> ۳۔ مختلف نسخوں اور ایڈیشنوں کی مدد سے صحیح ترین متن پیش کرنا۔
> ۴۔ بیش بہا معلومات پر مشتمل مقدمہ' حواشی اور اختلاف نسخ۔ (۱۳۸)

''نسخہ عرشی'' کی ترتیب میں عرشی صاحب نے اختلافِ نسخ کے ذریعے سے چودہ مخطوطات و مطبوعات کے متون فراہم کیے ہیں۔ ''نسخہ عرشی'' کو انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

الف۔ گنجینہ معنی: اس حصے میں ''نسخہ بھوپال'' اور ''نسخہ شیرانی'' کا وہ کلام ہے جو متداول دیوان میں نہیں لیا گیا۔ یعنی جسے غالب نے صریحاً رد کر دیا۔

ب۔ نوائے سروش: یہ متداول دیوان ہے جو بنیادی طور پر ۱۸۵۵ء کے ''نسخہ رام پور جدید'' پر مبنی ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ کلام جو مرزا غالب نے اپنی زندگی میں چھپوا کر تقسیم کیا تھا۔

ج۔ یادگارِ نالہ: مختلف مآخذ سے لیا ہوا متفرق کلام جسے نہ تو غالب نے مسترد کیا تھا اور نہ ہی ان کے کسی مرتبہ دیوان میں شامل ہو سکا تھا۔

عرشی نے غالبؔ کی معروف نظم 'مثنوی دعائے صباح'' کے متن کو از سر نو مرتب کر کے مئی ۱۹۴۱ء میں لکھنو سے شائع کیا۔ یہ مثنوی حضرت علیؓ سے منسوب ایک عربی دعا کا منظوم فارسی ترجمہ ہے۔ عرشی نے اس قلمی نسخے کی روشنی میں مدون کیا ہے۔ غالب نے یہ ترجمہ اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر کیا تھا۔ (۱۳۹) عرشی اپنے ایک مضمون میں اس مثنوی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ مثنوی اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں غالب کے ترجمے کی کوشش کا علم ہوتا ہے..... جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ میرزا صاحب نے اصل دعا کے مطلب اور مفہوم کو شعر فارسی میں پورا پورا کر دینے میں کمال کر دکھایا ہے' حتیٰ کہ بہت سے فقروں کا ترجمہ اتنے ہی مختصر

الفاظ میں کیا گیا ہے جتنے مختصر الفاظ اصل عربی کے تھے اور شاید ہی کسی جگہ اصل عربی کا کوئی لفظ میرزا صاحب کے ترجمے کی گرفت سے بچ نکلا ہو۔ (۱۴۰)

غالبیات پر امتیاز علی عرشی کا ایک اور نادر شاہکار ''فرہنگ غالب'' ہے۔ غالب نے فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اردو لغات کی تحقیق و تشریح جو وقتاً فوقتاً اپنے خطوط میں کی ہے، عرشی نے ان تمام مباحث کو یکجا کر کے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ یہ نادر کتاب ۱۹۴۷ء میں رام پور سے شائع ہوئی۔ کتاب کے نام کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے عرشی نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

چونکہ اس کا ہر ہر لفظ غالب ہی کا تر دیدہ ءِ قلم تھا، میں نے اس کا نام ''فرہنگ غالب'' تجویز کیا ہے۔ (۱۴۱)

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں عربی، فارسی اور دیگر زبانوں کے الفاظ ہیں جبکہ دوسرا حصہ اردو الفاظ پر مشتمل ہے۔ غالب کو لغات سے بڑی دلچسپی تھی۔ مولانا عرشی نے اس کتاب میں یہ تمام معلومات جمع کر دی ہیں۔ اس طرح گویا غالب کی ایک نئی کتاب، مرتب ہوگئی ہے۔ دیباچہ میں ہندوستانی لغت نویسوں کی ایک فہرست اور ان کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس طرح ''سبد باغ دودر'' کی تلخیص اور حواشی نگاری کا کام عرشی کا اہم کارنامہ ہے۔ ''مسودہ قاطع برہان'' کی تدوین، تبصرہ اور محاکمہ سے عرشی کی غالب شناسی کا ثبوت ملتا ہے۔ آخر میں ''مکاتیب غالب'' فارسی، کا ذکر اہمیت سے خالی نہیں ہے۔ اس مجموعے میں عرشی نے غالب کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط کو تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا ہے اور مختلف مآخذ کی روشنی میں متن کی تصحیح کا کام بھی سرانجام دیا ہے۔ لیکن یہ مجموعہ عرشی کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا۔

مرزا غالب پر عرشی کے اہم مضامین میں سے ''غالب کا معیارِ شعر سخن''، ''مرزا غالب کا زائچہ''، ''کلام غالب کا انتخاب کس نے کیا'' وغیرہ زیادہ اہم ہیں، جو عرشی کی غالب شناسی کی روشن دلیل ہیں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد کا شمار بھی غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ غالب پر ان کی دو کتابیں ''احوال غالب'' اور ''نقد غالب'' شائع ہو چکی ہیں۔ جمیل الدین عالیؔ ''نقد غالب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک نادر کتاب جو یہاں پاکستان میں ملتی ہی نہیں تھی وہ ہے ''نقد غالب'' ....اس کے بغیر نہ صرف غالبیات بلکہ قدیم و جدید اصول تنقید کے علاوہ بہت سی تاریخی پس منظر اور فکری تحریکات پر بیک وقت اتنا مواد کم ملتا ہے............''نقد غالب'' کی ہمہ جہتی اہمیت قطعی کم نہیں ہوئی بلکہ آج زیادہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ (۱۴۲)

اس کتاب کی ترتیب کے لئے جن مضامین کا انتخاب کیا گیا وہ غالب شناسی میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضمون نگاروں میں ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید احتشام حسین، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ (۱۴۳)

ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے ''نوادرِ غالب'' کے نام سے ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے جس میں مرزا غالب

کے وہ سارے رقعات اور مکاتیب' حواشی کے ساتھ جمع کر دیے ہیں جو اب تک کسی دوسرے مجموعے میں شامل نہ ہو سکے۔

اسی طرح انہوں نے ''گنجینۂ غالب'' کے عنوان سے ایک اور مجموعہ ترتیب دیا۔ جس کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ اپنی کتاب ''احوال غالب'' کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> گنجینۂ غالب'' زیر ترتیب ہے اس میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار ہوں گے.....اس کے علاوہ اس بات کے بھی انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ چند نایاب رسالے بھی ایڈٹ کر کے شائع کیے جائیں۔ اس مجموعے میں سارے مشاہیر اہل قلم نے حصہ لیا ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑا عجیب اور دلچسپ تحفہ ہوگا۔ (۱۴۴)

بعض ایسے نقاد بھی غالب کے مطالعہ میں پیش پیش نظر آتے ہیں' جن کا زاویہ نظر ترقی پسندانہ تھا۔ ان نقادوں میں پروفیسر سید احتشام حسین کا نام سب سے نمایاں ہے۔

احتشام حسین نے غالب کے بارے میں بعض بڑے اہم تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں غالب کی شخصیت کی پرداخت کے عوامل اور ان کی شاعری اور فن کے محرکات کو عمرانی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان مضامین میں ''غالب کا جہانِ دیر و کعبہ''، ''غالب کی بت شکنی'' اور ''غالب کا تفکر'' بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کی پیداوار اور ایک عظیم تہذیبی روایت کے علمبردار ہونے کے باوجود اپنے زمانے کے باغی تھے اور یہ بغاوت ان کی فکر اور فن دونوں میں نمایاں ہے۔ احتشام حسین نے غالب کے مطالعے میں اس پرے تہذیبی' معاشرتی اور معاشی پس منظر کو اپنے سامنے رکھا ہے جو عہد غالب سے متعلق ہے۔ اور غالب کو انہی تمام حالات کی پیداوار ثابت کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> غالب کے مطالعے کے سلسلے میں چند نظریاتی مباحث پر غور کرنا نہ صرف مفید ہوگا بلکہ ضروری بھی ہے۔ کیونکہ انیسویں صدی کے اس ہندوستان میں پیدا ہوئے جو مخصوص روایت کا حامل تھا' خاص طرح کا طبقاتی نظام رکھتا تھا۔ تاریخ' مذہب اور فلسفے میں پوری طرح اس زمانے کی جھلک نہ تھی' جو اس وقت کے معاشی اور معاشرتی انحطاط نے پیدا کی تھی.....ان حالات میں ایک روایت پرست شاعر یا ادیب کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص عقیدے کا سہارا لے کر اپنا رشتہ اس سے جوڑے.....لیکن غالب کے سے شاعر کے لیے یہ خیال درست نہ ہوگا۔ (۱۴۵)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ احتشام حسین غالب کو عمرانی اور مارکسی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے غالب کا مطالعہ صرف انفرادی نفسیات کی روشنی میں کیا ہے' ان سے احتشام حسین نے اختلاف کیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں:

> نفسیاتی کیفیت خارجی حالات سے باہر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی۔ اس لئے محمد اکرام کا غالبؔ کی ساری تحریک اور کامیابی کو محض احساس کمتری کا نتیجہ قرار دینا' نہ تو غالب کے شعور کا صحیح تجزیہ ہے اور نہ اصول

تنقید ہی کے لحاظ سے درست ہے۔ (۱۴۶)

مختصر یہ کہ احتشام حسین نے غالب کی زندگی کے تمام واقعات کو سامنے رکھ کر تجزیاتی انداز میں ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا سراغ لگایا ہے اور بعض ایسے حقائق تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک صحیح عمرانی اور مارکسی نقاد ہی کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری (۱۴۷) کا شمار بھی غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا تخلیقی کارنامہ غالبیات پر ان کی مشہور کتاب ''غالب شناسی'' ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے غالب کو اردو کے علاوہ فارسی شاعری کے آئینے میں دیکھا ہے۔ انہوں نے کتاب کے دیباچے میں اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کا روسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے گا۔ لکھتے ہیں:

> ہم نے غالب کے تمام فارسی کلام کو سمجھنے اور اپنی بساط بھر سمجھانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ فارسی میں ان کے اشعار کی تعداد دس ہزار سے اوپر ہے۔ اس کا تفصیلی مطالعہ کرتے وقت ۱۹۵۸ء کے شروع میں جو نوٹ جمع ہو گئے ان سے ایک مفصل کتاب تیار ہو گئی۔ ہم نے اس کا نام ''غالب شناسی'' رکھا اور حسبِ طلب روسی زبان میں ترجمہ کر کے اشاعت گھر کے حوالے کر دیا۔ لیکن اس کی اشاعت کا معاملہ غالب کی پنشن کا مقدمہ ہو گیا، جس کی داد تو برابر ملتی رہی، فیصلہ ہونے میں اٹھارہ برس لگ گئے۔ (۱۴۸)

بہر حال یہ کتاب روسی زبان میں شائع ہو گئی اور وہاں کثیر تعداد میں عام ہوئی۔ کوثر انصاری کے مطابق:

> ظ۔ انصاری کو روسی زبان میں غالب کی شخصیت و فن پر تخلیقی کتاب لکھنے پر ماسکو یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے۔ روسی زبان میں غالب پر یہ پہلی کتاب ہے اور اب تک اس کی ایک لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ (۱۴۹)

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اپنی تحریروں کے ذریعے سے غالب کی نجی زندگی کے ایسے خفیہ گوشے بے نقاب کیے ہیں اور اتنا کھل کر لکھا ہے، جس سے ان کی غالب شناسی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ غالب پر ان کا ایک مضمون ''غالب اور وفا کا تصور'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں انہوں نے غالب کو بے وفا شخص، بے وفا شاعر اور بے وفا فنکار کہا ہے۔ (۱۵۰)

''بے وفا شخص'' ہونے کی حیثیت سے وہ غالب کی زندگی کا ایک ناخوشگوار واقعہ لکھتے ہیں۔ یہ واقعہ اسی خاتون سے متعلق ہے جس کے ساتھ غالب کو زندگی کے ابتدائی دنوں میں محبت ہوئی تھی۔ اور وہ خاتون غفوانِ شباب میں ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گئی تھی۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس ساری تفصیل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> غالب سے اس خاتون کے تعلقات یہاں تک بڑھے کہ بالآخر وہ حاملہ ہو گئی اور چونکہ معاملہ ایک معزز خاندان کی بیٹی کا تھا، اور غالب نے اپنی ذمہ داری میں اضافہ قبول کرنے سے پہلوتہی کی.....اس نے خاموشی سے جان دے دی اور اب جواں مرگی پر معاملہ دب گیا۔ غالب بیماری پڑ گئے، غالب کو اس

بیماری سے کبھی شفا نہ ہوئی کیونکہ سالہا سال ان کے ضمیر میں اس کی وفا اور اپنی بے وفائی کا کانٹا کھٹکتا رہا' ورنہ ان اشعار کا کیا مطلب؟

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے (۱۵۱)

ڈاکٹر ظ۔انصاری کے غالب پر دیگر مضامین میں ''نشاط کا شاعر'' اور ''معنویت .....غالب کا مرکزِ نگاہ'' قابلِ ذکر مقالے میں انہوں نے کہا ہے کہ غالب کے نزدیک غم انسان کو بجھاتا نہیں بلکہ اس کے ادراک اور خرد کو صیقل کرتا ہے۔ غالب اشک طلب نہیں بلکہ نشاط طلب اور نشاط آموز شاعر ہیں اور اس بات کی تصدیق غالب کی شاعری اور بالخصوص ان کی اہم مثنویوں' خطوں اور خطوں کے لب و لہجے سے ہو جاتی ہے۔ (۱۵۲)

اسی طرح انہوں نے اپنے دوسرے مقالے میں کہا ہے کہ غالب نے حقیقت کو زندگی کی معنویت میں پایا۔ وہ لکھتے ہیں:

غالب ایک شخص یا شاعر ہی نہیں وہ ایک ''اپروچ'' ہے۔ زندگی کرنے کا ایک ہنر اور فن کو برتنے کا ایک رویہ ہے۔ اس اپروچ کو پہچان کر اور سمجھ کر ہی اس کے کلام کی معنویت اور نظر کی معنی طلبی ہم پر کھلتی ہے۔ (۱۵۳)

مولانا حامد حسن قادری کا شمار بھی غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ غالب پر ان کا کام بہت کم ہے لیکن معیاری ہے۔ وہ بنیادی طور پر مئورخ اور محقق ہیں۔ غالب کے حوالے سے ان کی نگارشات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ایوب قادری لکھتے ہیں:

انہوں نے غالب پر جو کچھ لکھا ہے وہ غالب شناسی میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ (۱۵۴)

مولانا حامد حسن قادری نے غالب کے اردو دیوان کا ایک مجموعہ ''انتخابِ غالب (اردو)'' کے عنوان سے ۱۹۴۱ء میں مرتب کیا تھا۔ (۱۵۵) اس کا خطی نسخہ ان کے خاندان کے پاس موجود ہے۔

انہوں نے ''انتخابِ غالب (فارسی)'' کے عنوان سے غالب کے فارسی کلام کا بھی انتخاب کیا ہے اور خاصی دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے ساتھ شرح بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ بھی اشاعت پذیر نہ ہو سکا اور اس کا خطی نسخہ ان کے خاندان کے پاس موجود ہے''۔ (۱۵۶)

''نقد و نظر'' کے عنوان سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی جس میں غالب پر تین مضامین شامل ہیں۔ اب ادارہء یادگارِ غالب' کراچی سے ان کی ایک کتاب ان کے بیٹے ڈاکٹر خالد حسن قادری نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ کتاب کا نام ''غالب کی اردو نثر اور دوسرے مضامین'' ہے جس میں مولانا قادری کے غالب پر نو (۹) مضامین شامل ہیں۔ وہ غالب کے اخلاق و عادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

غالب انسان دوست، استاذ، مربی، مخدوم، خادم، شہری، ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے، بہت بڑا حلقہء احباب رکھتے تھے۔ ہر شخص کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے اور واقعی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ خدمتِ احباب، ہمدردی، فیاضی کا یہ حال تھا کہ اپنی آمدن اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر صرف کر دیتے تھے، اس لئے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ لیکن ہمیشہ قرض کا سخت بار محسوس کرتے تھے اور جلد ادا کرنا چاہتے تھے۔ دوستوں اور شاگردوں سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رکھتے تھے..... باقاعدہ جواب دینے کا ایسا التزام تھا کہ بیماری، ضعف، معذوری میں بھی لیٹے لیٹے لکھ یا لکھوا دیتے تھے۔ (۱۵۷)

مولانا قادری نے غالب کی سیرت و شخصیت کے علاوہ غالب کی تصانیف اور دیگر علمی معرکوں پر ناقدانہ بحث کی ہے۔ انہوں نے ''غالب کی اردو نثر'' خطوط غالب اور غالب کی رباعیات فارسی میں بڑے اچھے مضامین لکھے ہیں۔ ان کا اسلوب منطقی اور پر جوش ہے وہ ہمیشہ مدلل تبصرے کیا کرتے تھے۔ کلامِ غالب کی تضمین پر اپنی عالمانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

مرزا غالب کی گونا گوں قدر دانیوں میں ایک عجیب و دلچسپ قدر دانی یہ بھی ہوئی ہے کہ شعراء نے ان کی غزلوں پر کثرت سے خمسے لکھے ہیں..... مرزا غالب کے کم سے کم دو فدائی تو میرے علم میں ہیں جنہوں نے از ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا'' تا ''صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے'' تمام پوری اور ادھوری غزلوں کی تخمیس کر دی ہے۔ (۱۵۸)

کسی بڑے شاعر کو داد دینے اور اس کے اندازِ بیان کو سراہنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس شاعر کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی جائے۔ بلا شبہ غالب ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کے ہم عصروں اور بعد کے شعراء نے ان کی زمینوں میں لکھنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں بہت سارے شعراء کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے مولوی علی بخش شرر کا ذکر یہاں اہمیت سے خالی نہ ہوگا۔ وہ غالب کے ہم عصر تھے۔ پانچ کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے ایک اردو دیوان بھی ہے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

کلام کا عام رنگ اس زمانے کا سا ہے یعنی ناسخ کی رعایت لفظی، ذوق کے محاورے، جرات کی معاملہ بندی، شاہ نصیر کی مشکل ردیفیں سب کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے اشعار صاف اور سادے ہیں اور ان میں تغزل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ (۱۵۹)

وہ مرزا غالب کے معتقد بھی تھے اور ان کے ساتھ ان کی معاصرانہ چشمک بھی رہتی تھی۔ (۱۶۰) انہوں نے کئی ایک اشعار غالب کی زمینوں میں کہے ہیں۔ ایک مرتبہ مولوی کرم حسین بلگرامی نے اپنے ہاتھ میں چکنی ڈلی رکھ کر کچھ اشعار کہنے کی فرمائش کی جس پر مرزا غالب نے ایک دلچسپ قطعہ کہا تھا جس پہلا شعر یہ ہے:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے (۱۶۱)

اسی زمین میں علی بخش شرؔر نے ایک پیچواں (حقہ) پر قطعہ کہا جو بانداز غالب شعر کہنے کی عمدہ مثال ہے۔اور غالب شناسی کی توانا روایت کا پتا دیتا ہے' چند اشعار درج ذیل ہیں:

پیچواں حقہ عنایت جو کیا حضرت نے
جگر و دل پہ یہ جھگڑا ہے اسے کیا کہیے
آبِ حیوان کے یہ بھرنے کی صراحی ہے مگر
حضرتِ خضر کی تسبیح کا شمسا کہیے
نَے کو دیکھو تو ہے اک زاہدِ لاغر کی مثال
ذکرِ حق حق کو نہ کیوں اس کا وظیفہ کہیے
آتشِ گل سے جو اس نَے پہ چمکتی ہے چلَم
ساتھ موسیٰ کے ضیائے یدِ بیضا کہیے
گبر اس نَے کو سمجھتے ہیں کہ ہے نار پرست
کیوں نہ پھر حقے کو ناقوسِ کلیسا کہیے
گوشِ غلماں کا تو آویزہ یہ حقہ ہے' شرؔر
نیچے کو رشک دہِ گیسوئے حورا کہیے (۱۶۲)

شرؔر کے دیوان میں کئی غزلیں بھی ہم طرح ملتی ہیں۔اگر چہ انہوں نے غالب کی زمینوں میں لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن بقول پروفیسر آل احمد سروران کی غزلیں غالب کی غزلوں سے بہت پھیکی ہیں۔ان میں ذوق کا رنگ زیادہ ہے۔ (۱۶۳)

غالب کے جن ہم عصر شعراء نے ان کی زمینوں اور ان کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ان میں ایک مولوی احمد حسن رسواؔ ہیں' ان کا ایک دیوان فارسی میں ہے اور ایک اردو میں۔انہوں نے اپنے انداز میں کل ۳۸ غزلیں غالبؔ کی زمین میں کہی ہیں۔ (۱۶۴) اسی طرح دیگر شعراء میں فانیؔ بدایونی' امیرؔ بدایونی' اعتماد الدین عرشیؔ' عرشؔ بریلوی' عماد الحسن محوؔ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ان شعراء کے بعد نامور عالم دین اور نعت گو مولانا احمد رضا خان بریلوی کی ایک نعت کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں جو انہوں نے غالب کی ایک غزل:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار' کوئی ہمیں ستائے کیوں (۱۶۵)

کی زمین میں کہی ہے:

پھر کے گلی گلی تباہ، ٹھوکریں سب کے کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا، تیریؐ گلی سے جائے کیوں
یادِ حضورؐ کی قسم غفلتِ عیش ہے ستم
خوب ہیں قیدِ غم میں ہم، کوئی ہمیں چھڑائے کیوں
جان ہے عشقِ مصطفیٰؐ، روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزا، نازِ دوا اٹھائے کیوں
ہے تو رضاؔ نرا ستم جرم پہ گر لے جائیں ہم
کوئی بجائے سوزِ غم، سازِ طرب بجائے کیوں (۱۶۶)

احمد رضاؔ خان بریلوی نے غالب کے تتبع میں اگر چہ نعت کہی ہے لیکن غالب کا انداز اپنانے کی کوشش بھی کی ہے جس سے نعت میں تغزل کا رنگ غالب آ گیا ہے۔ یہ انداز بھی غالب شناسی کی روایت کو آگے لے جانے میں مدد دیتا ہے۔

اردو شعراء کی طرح اس عہد کے فارسی شعراء بھی غالب کے تتبع میں شعر کہنا عظمت سمجھتے تھے۔ اکبر علی خان نے اپنے مقالے میں چھ فارسی شعراء کا تذکرہ کیا ہے جو غالب کی زمین میں شعر کہا کرتے تھے۔ ان شعراء میں احمد علی مجروحؔ، فطرتؔ کاکوروی، اصغر علی شعلہؔ، شیخ طالب علی مقتولؔ، پران سنگھ شوکتؔ اور منشی بھگوان داس جانبازؔ کے نام شامل ہیں۔ (۱۶۷) ذیل میں محولہ بالا تمام شعراء کا ایک ایک فارسی شعر درج کیا جاتا ہے، ساتھ ہی غالب کی غزل کا مطلع بھی نقل کیا جاتا ہے۔ جن کے تتبع میں غزلیں کہی گئیں:

غالبؔ کا شعر تھا:

لبِ اُو آبِ حیواں راد ہد آبِ بقا اِمشب | مگر ایں تلخیِ دوراں شدہ لا انتہا اِمشب

اس پر فطرتؔ نے کہا:

شہادت می کند چوں مدعا بر مدعا اِمشب | شدہ شمشیرِ ابرو شہپر بالِ ہما اِمشب

شعلہؔ نے شرر ریزی کی:

رسیدہ می رود از خویشتن آں آشنا اِمشب | بخاک اُفتادہ ام ہر شام اے صبح صفا اِمشب

مقتولؔ کا مطلع تھا:

وفا ہا دیدہ ام از بے وفائی در وفا اِمشب | جفا ہا می کُنی بر خویشتن چوں از جفا اِمشب

جانبازؔ نے اس طرح ہمت دکھائی:

پریشانی شدہ از کارِ خود در انتہا اِمشب | معطر شد ز بوئے زلف او باد صبا اِمشب

شوکتؔ نے غزل کا مطلع یہ کہا:

بہ فانوسِ خیال آید اگر آں دلربا اِمشب　　شمع درکار باشد چوں بریزد انہا اِمشب (۱۶۸)

ہم طرح غزلوں کے ساتھ ساتھ اس عہد کے بعض شعراء نے کلام غالب کی تضمین میں خمسے بھی کہے ہیں۔ غالب کے شاگردوں میں میر مہدی مجروحؔ کے غالب کی دو غزلوں پر خمسے دستیاب ہیں۔ علاوہ ازیں بیانؔ میرٹھی نے ایک غزل کی تضمین کی ہے۔ شاگردوں کے علاوہ بعض اور شعروں نے بھی غالب کی غزلوں پر خمسے لکھے ہیں۔ لیکن پورے دیوانِ غالب کو تضمین کرنے کا کمال سب سے پہلے مرزا عزیز بیگ (مرزا سہارن پوری) نے دکھایا ہے۔ مرزا عزیز قدیم مدرسہء شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اندازِ بیاں، اسلوبِ بیاں اور طرزِ تخیل میں قدامت کا اثر ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ غالب کی ایک مشہور غزل پر مرزا صاحب کا خمسہ بطور نمونہ درج ہے:

ابر مژگاں نے جو ٹھہرائی ہے برسانے کی
نوبت آئے نہ کسی دن مرے بہہ جانے کی
شکل ہونے لگی ہر گوشے میں ویرانے کی
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا (۱۶۹)

نو اشعار کی اس غزل میں پانچ خمسے نہایت موزوں اور پر لطف ہیں جو شاعر کی مشاقی کا ثبوت ہونے کے علاوہ غالب شناسی کی غمازی کرتے ہیں۔ غالب کی ایک اور غزل پر مرزاؔ کا خمسہ ملاحظہ ہو:

ظلم و ستم کا وقت ہے کوئی نہ جور کا
اک کھیل ہوگیا کہ جب اُٹھے ستا لیا
دل اب تو نام سے ہے محبت کے کانپتا
کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر (۱۷۰)

اس خمسے کے مصرعے بظاہر اچھے ہیں لیکن ایک خامی رہ گئی ہے کہ غالب کے شعر کا اصلی مفہوم تضمین میں نہیں آیا۔ مرزا عزیز بیگ کے مصرعوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا محبوب جب اٹھتا ہے انہیں ستاتا ہے۔ ظلم کو اس نے ایک کھیل بنالیا ہے، جبکہ غالب کے شعر میں جفا کے عام ہونے سے یہ مقصود ہے کہ محبوب اغیار پر بھی جفا کرتا ہے۔ اسی طرح ''بے سبب آزار'' کے بھی یہی معنی ہیں کہ ستانے میں محبوب امتیاز ملحوظ نہیں رکھتا۔

اس غزل کے دیگر اشعار میں سے بعض شعروں کی تضمین نہایت پر لطف اور قابل تحسین ہے۔ ملاحظہ ہو ایک خمسہ:

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق
ہے لغزش خرام سے زخمی درونِ خلق

شیشہ ہوا ہے باعثِ حال زبونِ خلق
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر(۱۷۱)

اس تضمین میں مصرعوں کی ساخت اور بندش قابل داد ہے۔ ایسے ہی مصرعوں سے شرح کا حق ادا ہوتا ہے۔ تیسرا مصرع نہایت معنی خیز ہے۔

غالب کی جن غزلوں کی اوروں نے بھی تضمین کی ہے ان میں صرف ایک غزل ایسی ہے جس کے چار خمسے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کا تقابلی جائزہ نقل کیا جاتا ہے جس سے غالب شناسی کی روایت مستحکم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان شعراء میں میر مہدی مجروح، مرزا عزیز بیگ، صبا اکبر آبادی اور مولانا حامد حسن قادری کے خمسے قابل ذکر ہیں۔

میر مہدی مجروح:

کام نخوت سے کچھ روا نہ ہوا
درِ حاجت کسی پہ وا نہ ہوا
کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا
درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا(۱۷۲)

مرزا عزیز بیگ:

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا
کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا
مجھ پہ احساں طبیب کا نہ ہوا
درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا(۱۷۳)

صبا اکبر آبادی:

شکر ہے مجھ کو فائدہ نہ ہوا
چارہ گر باعثِ شفا نہ ہوا
خوش ہوں، احسان غیر کا نہ ہوا
درد منت کشِ دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا' برا نہ ہوا(۱۷۴)

حامد حسن قادری:

نام بدنام عشق کا نہ ہوا
میں بھی شرمندہء وفا نہ ہوا
یہ برا کیوں ہوا' بھلا نہ ہوا
درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا' برا نہ ہوا(۱۷۵)

محولہ بالا خمسوں میں میر مجروح کے مصرعے محض تبرک ہیں۔ مرزا اور حامد کی تضمینیں بھی مناسب ہیں لیکن صبا اکبرآبادی کی تضمین سب سے عمدہ اور غالب کے شعر کی معنویت کو اجاگر کرنے والی ہیں۔ یہ تضمین لائق تحسین ہے۔

مطالعہء غالب کے آخر میں ان تاریخی قطعات کا ذکر غالب شناسی کا ایک حصہ ہے جو غالب کی وفات پر اس عہد کے چند شعراء نے کہے تھے۔ یہ قطعات اگرچہ کچھ گمنام شعراء کی تخلیق ہیں لیکن اندازِ بیان اور اسلوب کے اعتبار سے فنِ تاریخ گوئی کی عمدہ مثال ہیں۔ غالب کی وفات پر شاعروں نے جو تاریخی قطعات لکھے ان کے بارے میں مولانا حالی نے لکھا ہے:

ان کی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اردو اخباروں میں چھپتی رہیں' وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں۔(۱۷۶)

ذیل میں چند ایک تاریخی قطعات' رباعیات درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ منشی فضل حسین برشتہ

اٹھا دنیا سے کیا مرزائے غالب
جہاں سے اُٹھ گئی شیریں بیانی
برشتہ نے لکھی تاریخِ رحلت
موا ہے سعدی شیراز ثانی
(۱۲۸۵ھ)(۱۷۷)

۲۔ منشی اسماعیل حسین منیر

آں غالبِ دہلوی کلیمِ دوراں
سلطانِ سخن ' غلامِ آل یٰسیں
در نظم و زبان فارسی نامی دہر
در نثر بمسند افادات مکیں

برداشتہ رخت ازیں سرائے فانی
یا رب برسانیش بفردوس بریں
دنیا ست سیاہ بدیدہء اہلِ سخن
در برجِ لحد چو رفت آں مہر مبیں
تاریخ وفات او چنیں گفت منیر
آہ افصح عصر و حیف ثانی
حزیں(۱۲۸۵ھ)(۱۷۸)

۳۔سحر بدایونی

حیف کہ غالب ز جہاں رخت بست
بود یکے شاعرِ باحلم و فضل
مرد چو او ایں ہمہ بے جان شدند
شعر و سخن، نثر و ہنر، علم و فضل
(۱۲۸۵ھ)(۱۷۹)

۴۔مفتی محمد حسن بریلوی

غالب کہ بود پیر مغان سخنوری
زیں دہر چوں بدار سلامت گرفت راہ
ساغر شکست و میکدہء شعر شد خراب
مینا گریست زار کہ ''غالب بمرد
آہ''(۱۲۸۵ھ)(۱۸۰)

۵۔عبدالحکیم جوش

''مرد ہیہات میرزا نوشہ''
(۱۲۸۵ھ)۔(۱۸۱)

۶۔سید آل محمد مارہروری

جنابِ میرزا نوشہ صد افسوس
ہوئے دارِ فنا سے رہگرا آج

لکھ اے آلِ محمد سال منقوط

کہ رشکِ حافظ وطالب مرا آج

(۱۲۸۵ھ)(۱۸۲)

غالب کی شخصیت اور شاعری پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ شاید کسی دوسرے شاعر کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ حتی کہ اقبال پر لکھنے والوں نے بھی اتنا پائے کا نہیں لکھا جتنا عمدہ تحریری سرمایہ غالب کے حصے میں آئی ہے۔

غالب پر صرف نثر میں ہی نہیں لکھا گیا بلکہ انہیں منظوم خراجِ تحسین بھی پیش کئے گئے۔ مختلف شعراء کی ان پر نظمیں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف ہی نہیں بلکہ غالب شناسی کی اعلیٰ قدروں کا استحکام بھی ہیں جس سے یہ روایت قیام پاکستان کے بعد پوری توانائی کے ساتھ سفر کرتی ہوئی اکیسویں صدی میں داخل ہوجاتی ہے۔ غالب پر حالی اور اقبال کے مرثیے اپنی مثال آپ ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند غالب پر نقد ونظر کے ضمن میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> اردو میں غالب پر جتنا زیادہ لکھا گیا ہے اتنا باستثنائے اقبال کسی اور ادیب پر نہیں لکھا گیا' لیکن غالب پر جس پائے کے ادیبوں نے لکھا ہے اور جس قسم کی تاریخ ساز کتابیں لکھی ہیں وہ اقبال کا بہرہ نہیں۔(۱۸۳)

حوالہ جات/حواشی

۱۔ بحوالہ حالی' مولانا الطاف حسین، یادگارِ غالب، (لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۶۳ء)' ص ۱۳۸

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۳۶

۳۔ غالب' مرزا اسداللہ خان۔ کلیاتِ نثر فارسی: پنج آہنگ' سید فاضل لکھنوی' مرتب؛ (لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۶۷ء)' ص ۲۴۹

۴۔ امتیاز علی خان عرشی۔ مرتب؛ ''دیباچہ''، دیوانِ غالب اُردو (نسخہ عرشی)، (علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو' ۱۹۵۸ء)' ص ۱۳

۵۔ مالک رام۔ ذکرِ غالب۔ (لاہور: مکتبہ شعروادب ' ۱۹۷۵ء)' ص ۴۰

۶۔ احمد خان' سرسید۔ آثار الصنادید۔ (دہلی: سید الاخبار' ۱۸۴۷ء)' ص ۱۵۲ تا ۱۶۵

۷۔ ایضاً۔ ص ۱۶۵

۸۔ معین الرحمٰن' ڈاکٹر سید۔ غالب کا علمی سرمایہ۔ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز' ۲۰۰۰ء)' ص ۲۸

۹۔ اشپرنگر۔ یادگارِ شعراء' طفیل احمد' مترجم؛ (لکھنو: اتر پردیش اُردو اکیڈمی' ۱۹۸۵ء)' ص ۷

۱۰۔ بحوالہ فرمان فتح پوری' ڈاکٹر۔ غالب شاعر امروز وفردا۔ (لاہور: اظہار سنز' ۱۹۷۰ء)' ص ۱۴

۱۱۔ ایضاً' ص ۱۵

۱۲۔ دیوانِ غالب اُردو (نسخہ عرشی)' ص ۳۹۵

۱۳۔ مالک رام۔مرتب؛ دیوانِ غالب اُردو؛ (دہلی: آزاد کتاب گھر، ۱۹۵۷ء)، ص ۳۲۳

۱۴۔ سرور، اعظم الدولہ۔عمدہ منتخبہ، خواجہ احمد فاروقی، مرتب؛ (دہلی: دہلی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء)، ص ۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۶ ۱۶۔ایضاً، ص ۱۱۶ تا ۱۲۰

۱۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔غالب شاعرِ امروز و فردا، ص ۱۱

۱۸۔ شیفتہ، نواب مصطفیٰ خان۔گلشنِ بے خار، (لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۹۱۰ء)، ص ب

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۳۹ تا ۱۴۳ ۲۰۔ایضاً، ص ۱۴۳

۲۱۔ کریم الدین۔گلدستہ نازنیناں۔(دہلی: مطبع سلطانی، ۱۸۴۵ء)، ص ج

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۱۵ تا ۲۲۲ ۲۳۔ایضاً، ص ۱۹۱

۲۴۔ دیوانِ غالب اُردو (نسخہ عرشی)، ص ۲۹۸

۲۵۔ دیوانِ غالب اُردو (نسخہ مالک رام)، ص ۲۸۳

۲۶۔ معروف، الٰہی بخش۔دیوان معروف۔(بدایون: مطبع نظامی پریس، ۱۹۳۵ء)، ص ۶۱

۲۷۔ شیفتہ، نواب مصطفیٰ خان۔گلشنِ بے خار، ص ۲۳۱

۲۸۔ باطن، قطب الدین۔گلستانِ بے خزاں، معروف بہ نغمہ عندلیب، (لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۷۴ء)، ص ۱۷۳

۲۹۔ احمد خان، سرسید۔آثار الصنادید، ص ۱۱۸۔۱۱۹

۳۰۔ ''غالب پر سرسید کا ایک سو بارہ سال پرانا مضمون''، مشمولہ: سورج۔جلد دوم، غالب نمبر، (لاہور: سورج پبلشنگ بیورو، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۱۶

۳۱۔ صابر، مرزا قادر بخش۔گلستانِ سخن، (میرٹھ: مطبع اخبارِ عالم، ۱۸۵۵ء)، ص ۱۵۷۔۱۵۸

۳۲۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر محمد۔''غالب کا زمانہ''، مشمولہ: صحیفہ۔حصہ اوّل، غالب نمبر، (لاہور: شمارہ نمبر ۴۶، جنوری ۱۹۶۹ء)، ص ۱۱

۳۳۔ غالب، مرزا اسد اللہ۔عودِ ہندی۔(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء)، ص ۲۸۱

۳۴۔ عتیق صدیقی، محمد۔ہندوستانی اخبار نویسی۔(علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۷ء)، ص ۲۹۴

۳۵۔ اودھ اخبار۔(لکھنو: جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱، یکم جنوری ۱۸۶۲ء)، ص ۱، ۲

۳۶۔ ایضاً۔جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۲، ۸/جنوری ۱۸۶۲ء، ص ۲

۳۷۔ ایضاً۔جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۲۱، ۳/جون ۱۸۶۲ء

۳۸۔ ایضاً۔جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۱۴، ۲۵/مارچ ۱۸۶۳ء

۳۹۔ ایضاً۔جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱۷، ۲۳/اپریل ۱۸۶۲ء

۴۰۔ ایضاً۔جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۲۰، مئی ۱۸۶۲ء

۴۱۔ مہر، مولانا غلام رسول۔غالب۔(لاہور: شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۴۴ء)، ص ۴۳۸

۴۲۔ بحوالہ سجاد، ڈاکٹر سید۔''غالب کے متعلق ۱۸۶۸ء کا ایک انگریزی خط''، مشمولہ: غالب نامہ آور، (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۹ء)، ص ۳۷۔۴۷

۴۳۔ بحوالہ بدر شکیب۔ اُردو صحافت۔ (کراچی: ۱۹۵۲ء)، ص ۶۹۔۲۶۸

۴۴۔ بحوالہ امداد صابری۔ تاریخ صحافت۔ جلد دوم، (کراچی: انجمن ترقی اُردو ۱۹۷۹ء)، ص ۱۴۶

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۴۶۔ خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام۔ ''غالب اور ان کی ہم عصر صحافت''، مشمولہ: صحیفہ۔ حصہ اوّل، غالب نمبر، (لاہور: شمارہ نمبر ۴۶، جنوری ۱۹۶۹ء)، ص ۱۰۷

۴۷۔ امداد صابری۔ تاریخ صحافت، جلد دوم، ص ۲۳۵

۴۸۔ بحوالہ آرزو، مختار الدین احمد۔ احوالِ غالب۔ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۹

۴۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ غالب شاعر امروز و فردا، ص ۳۱۳

۵۰۔ ایضاً۔ ص ۳۱۴

۵۱۔ مجروح، میر مہدی۔ ''دیباچہ'' اُردوئے معلّٰی۔ (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۹ء)، ص ۴، ۵

۵۲۔ بحوالہ فیاض محمود، سید۔ تنقید غالب کے سو سال۔ (لاہور: مجلس یادگارِ غالب، ۱۹۶۹ء)، ص ۷

۵۳۔ بحوالہ صحیفہ۔ حصہ اوّل، غالب نمبر۔ (لاہور: شمارہ نمبر ۴۶، جنوری ۱۹۶۹ء)، ص ۸۷

۵۴۔ بحوالہ تنقیدِ غالب کے سو سال، ص ۹

۵۵۔ امیر مینائی، منشی امیر احمد۔ انتخابِ یادگار۔ (لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۷۹ء)، ص ۱۱۷

۵۶۔ آزاد، مولانا محمد حسین۔ آبِ حیات۔ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۰۔۵۱۸

۵۷۔ بحوالہ تنقید غالب کے سو سال، ص ۳۳، ۳۶

۵۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ غالب اور مطالعہء غالب۔ (لاہور: ادارہء ادب و تنقید، ۱۹۹۴ء)، ص ۴۲۸

۵۹۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ رموزِ غالب۔ (کراچی: ادارہء یادگارِ غالب، ۱۹۹۹ء)، ص ۳۷۰

۶۰۔ حالی، مولانا الطاف حسین۔ یادگارِ غالب، ص ۱۷۸

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۶۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ تفہیمِ غالب۔ (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۶، ۱۷

۶۳۔ حالی، مولانا الطاف حسین۔ یادگارِ غالب، ص ۲۲۱

۶۴۔ ایضاً، ص ۲۳۵ ۶۵۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۶۶۔ اثر، سید امداد امام۔ کاشف الحقائق معروف بہ بہارستانِ سخن۔ (لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۹۷ء)، ص ۱۴۱۔۱۵۸

۶۷۔ بحوالہ تنقیدِ غالب کے سو سال، ص ۸۲

۶۸۔ صلاح الدین خدا بخش۔ غالب۔ ضیاء الدین احمد برنی، مترجم؛ (ماہِ نو۔ کراچی: جلد نمبر ۹، شمارہ نمبر ۱۔ ۱۹۵۷ء)، ص ۱۵

۶۹۔ شاکر میرٹھی، پیارے لال۔ مرزا غالب دہلوی کی شاعرانہ عظمت۔ (ادیب، الٰہ آباد: جولائی، ستمبر ۱۹۱۲ء)، ص ۲۳

۷۰۔ عبدالماجد دریا آبادی۔ غالب کا فلسفہ۔ (ادیب، الٰہ آباد: جنوری ۱۹۱۳ء)، ص ۳۱

۷۱۔ زاد، مولانا ابوالکلام۔ مرزا غالب مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام۔ (الہلال، دہلی: جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۲۴۔ ۱۷ر جون ۱۹۱۴ء)

۷۲۔ ایضاً۔ ۷۳۔ ایضاً۔

۷۴۔ ایضاً۔ ۷۵۔ ایضاً۔ جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۴۔ یکم جولائی ۱۹۱۴ء

۷۶۔ ایضاً۔ جلد نمبر ۵، شمارہ نمبر ۸۔ ۲۲/ جولائی ۱۹۱۴ء

۷۷۔ البلاغ۔ دہلی: جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۱۵۔ ۳۱/ مارچ ۱۹۱۶ء

۷۸۔ بحوالہ دیوانِ غالب اُردو (نسخہ شیرانی)، ص ۳۹۲

۷۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ غالب اور مطالعہ غالب، ص ۴۳۴

۸۰۔ عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر۔ محاسنِ کلام غالب، غلام حسین ذوالفقار، مرتب؛ (کراچی: دارالکتاب، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۱

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۸۲۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ رموزِ غالب، ص ۳۷۳

۸۳۔ عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر۔ محاسنِ کلام غالب، ص ۱۳۸

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۸۵۔ عبداللطیف، ڈاکٹر سید۔ غالب۔ (دہلی: جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۲۸ء)، ص ۸۲۔۹۱

۸۶۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کے غالب کے بارے میں ان خیالات کی تفصیل آگے ''غالب شکنی کی روایت''، کے ضمن میں درج ہے۔

۸۷۔ غالب اور مطالعہ غالب، ص ۴۳۸

۸۸۔ ہاشمی فرید آبادی، سید۔ غالب کا فلسفہ۔ ماہنامہ اُردو۔ (اورنگ آباد: اکتوبر ۱۹۲۵ء)

۸۹۔ ایضاً۔

۹۰۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ رموزِ غالب، ص ۳۷۵

۹۱۔ اکرام، شیخ محمد۔ غالب نامہ۔ (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۳۹ء)، ص ۲۳۷

۹۲۔ ایضاً، ص ۲۵۸

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۱۲، ۱۱۳

۹۴۔ ایضاً۔ حیاتِ غالب۔ (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۲ء)، ص ۸

۹۵۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر (علی گڑھ: ۱۹۴۹ء)، ص ۸۷

۹۶۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید۔ تحقیق نامہ غالب۔ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۴۱۱

۹۷۔ بحوالہ ایضاً، ص ۴۱۴

۹۸۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر۔ غالب کی طنز و ظرافت۔ مشمولہ: سورج۔ غالب نمبر، جلد دوم، (لاہور: سورج پبلشنگ بیورو، ۲۰۰۳ء)، ص ۳۲۳

۹۹۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر۔ غزل، غالب اور حسرت۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مرتب؛ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۴۱

۱۰۰۔ بحوالہ تنقیدِ غالب کے سو سال، ص ۲۸۶

۱۰۱۔ سرور، آل احمد۔ غالب کا تنقیدی شعور۔ مشمولہ: العلم۔ (کراچی: جلد نمبر ۱۷، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۶۹ء)، ص ۳۴۹

۱۰۲۔ ایضاً۔عکس غالب۔(علی گڑھ:علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'۱۹۷۳ء)'ص ۷

۱۰۳۔ ایضاً'ص ۱۹

۱۰۴۔ معین الرحمٰن'ڈاکٹر سید۔نقوش غالب۔(لاہور:الوقار پبلی کیشنز'۱۹۹۵ء)'ص ۹۰

۱۰۵۔ گیان چند'ڈاکٹر۔رموزِ غالب'ص ۳۰۳

۱۰۶۔ ایضاً'ص ۳۰۳

۱۰۷۔ بحوالہ نقوش۔(لاہور:خطوط نمبر۔جلد نمبر ۳'شمارہ نمبر ۱۰۹)'ص ۱۷۱

۱۰۸۔ ایوب قادری'ڈاکٹر محمد۔غالب اور عصرِ غالب۔(کراچی:غضنفر اکیڈمی پاکستان'۱۹۸۲ء)'ص ۱۲۷

۱۰۹۔ صباح الدین عبدالرحمٰن۔مالک رام ایک مطالعہ'علی جواد زیدی'مرتب؛(دہلی:۱۹۸۲ء)'ص ۹۴

۱۱۰۔ مالک رام۔مخطوطات'تلاش'قرات'ترتیب۔آج کل۔(دہلی:تحقیق نمبر'اگست ۱۹۶۷ء)'ص ۱۶

۱۱۱۔ ایضاً۔مشمولہ:ادبی دنیا۔(لاہور:ستمبر ۱۹۳۹ء)

۱۱۲۔ ایضاً۔مشمولہ:جامعہ دہلوی۔(دہلی:مارچ ۱۹۴۲ء)

۱۱۳۔ ایضاً۔مشمولہ:اردو۔(اورنگ آباد:جولائی ۱۹۴۷ء)

۱۱۴۔ ایضاً۔مشمولہ:آج کل۔(دہلی:فروری ۱۹۵۳ء)

۱۱۵۔ مالک رام۔مشمولہ:نقوش۔(لاہور:مارچ ۱۹۶۳ء)

۱۱۶۔ ایضاً۔مشمولہ:آج کل۔(دہلی:فروری ۱۹۶۷ء)

۱۱۷۔ ایضاً۔مشمولہ:احوالِ غالب'مختیارالدین احمد آرزو'مرتب؛

۱۱۸۔ گیان چند'ڈاکٹر۔رموزِ غالب'ص ۳۵۴

۱۱۹۔ سجاد احمد لاڑ۔غالبیات۔(راجن پور:فہیم اکیڈمی'۱۹۹۰ء)'ص ۵۷

۱۲۰۔ شوکت سبزواری'ڈاکٹر۔فلسفہ کلام غالب۔(کراچی:انجمن ترقی اُردو'۱۹۶۹ء)'ص ۱۱۳

۱۲۱۔ عبداللطیف'ڈاکٹر سید۔غالب'ص ۸۰

۱۲۲۔ نیاز فتح پوری۔مشکلات غالب۔(کراچی:ادارہ نگار پاکستان'۱۹۶۲ء)'ص ۳۷

۱۲۳۔ اکرام'شیخ محمد۔غالب نامہ'ص ۳۰۷

۱۲۴۔ عبادت بریلوی'ڈاکٹر۔فلسفہ کلامِ غالب'ص ۱۷۴

۱۲۵۔ شوکت سبزواری'ڈاکٹر۔غالب فکر وفن۔(کراچی:انجمن ترقی اُردو'۱۹۶۱ء)'ص ۶۴

۱۲۶۔ ایضاً'ص ۶۷

۱۲۷۔ باراوّل:۱۹۱۵ء۔دوم:۱۹۲۰ء۔سوم:۱۹۲ء۔چہارم:۱۹۲۵ء۔پنجم:۱۹۲۷ء

۱۲۸۔ محمود'ڈاکٹر سید۔مقدمہ دیوانِ غالب۔(نظامی ایڈیشن)(بدایون:نظامی پریس'۱۹۲۳ء)'ص ۵

۱۲۹۔ بحوالہ نقوش۔(لاہور:شاہ نمبر ۸۹۔۹۰ جون ۱۹۶۰ء)

۱۳۰۔ نظامی بدایونی۔نکاتِ غالب۔(بدایون:نظامی پریس'جنوری ۱۹۲۰ء)'ص ۸

۱۳۱۔ عبدالودود، قاضی۔ مآثرِ غالب۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، تصحیح و ترتیب جدید؛ (کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۶

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۳۳۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ رموزِ غالب، ص ۴۳۷

۱۳۴۔ بحوالہ غالب نامہ۔ (دہلی: جولائی ۱۹۸۸ء)، ص ۲۳۳

۱۳۵۔ ایوب قادری، ڈاکٹر محمد۔ غالب اور عصرِ غالب، ص ۱۹۶

۱۳۶۔ بحوالہ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید۔ غالب کا علمی سرمایہ۔ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۱۹۱

۱۳۷۔ بحوالہ اُردو۔ (اورنگ آباد: اکتوبر ۱۹۴۲ء)

۱۳۸۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ رموزِ غالب، ص ۲۲۳

۱۳۹۔ رضا، کالی داس گپتا۔ متعلقات غالب۔ (بمبئی: ساکار پبلشر، ۱۹۷۸ء)، ص ۵۲

۱۴۰۔ امتیاز علی عرشی۔ مثنوی دعائے صباح۔ مشمولہ: نگار۔ (لکھنو: مئی ۱۹۴۱ء)، ص ۱۱

۱۴۱۔ امتیاز علی عرشی۔ فرہنگِ غالب۔ (رام پور: اشاعت خانہ، ۱۹۴۷ء)، ص ۲۱

۱۴۲۔ بحوالہ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید۔ تحقیق نامہء غالب، ص ۳۸۱

۱۴۳۔ آرزو، ڈاکٹر مختیار الدین احمد۔ نقدِ غالب۔ (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۴

۱۴۴۔ ایضاً، احوالِ غالب، ص ۱۱

۱۴۵۔ احتشام حسین، پروفیسر سید۔ غالب کا تفکر۔ مشمولہ: اُردو ادب۔ (علی گڑھ: جولائی ۱۹۵۰ء)، ص ۶۳

۱۴۶۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۴۷۔ اصل نام ظلِ حسنین ہے۔ ۶/فروری ۱۹۲۵ء کو سہارنپور، محلّہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ (بحوالہ تحقیق نامہء غالب۔ ص ۲۶۵)

۱۴۸۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر۔ غالب شناسی۔ (بمبئی: ساہتیہ ٹرسٹ، ۱۹۶۵ء)، ص ۴

۱۴۹۔ بحوالہ افکار۔ (کراچی: (غالب نمبر) ۲۴واں سال، شمارہ نمبر ۳، ۱۹۶۹ء)۔

۱۵۰۔ عاصمہ اعجاز۔ غالب نامہ۔ تجزیاتی مطالعہ۔ (لاہور: یونیورسل بکس، فروری ۱۹۹۴ء)، ص ۱۹۰

۱۵۱۔ ظ۔ انصاری، ڈاکٹر۔ غالب اور وفا کا تصور۔ مشمولہ: سورج، جلد اوّل، غالب نمبر، (لاہور: سورج پبلشنگ بیورو، ۱۹۹۷ء)، ص ۵۱۶

۱۵۲۔ ایضاً۔ نشاط کا شاعر۔ مشمولہ: غالب نامہ۔ (دہلی: جنوری ۱۹۸۲ء)، ص ۱۵

۱۵۳۔ ایضاً۔ معنویت۔ غالب کا مرکز نگاہ۔ ایضاً۔ جنوری ۱۹۸۹ء، ص ۵۹

۱۵۴۔ ایوب قادری، ڈاکٹر محمد۔ غالب اور عصر غالب، ص ۲۰۳

۱۵۵۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید۔ اشاریہء غالب۔ (لاہور: مجلس یادگارِ غالب، ۱۹۶۹ء)، ص ۲۶۸

۱۵۶۔ ایوب قادری، ڈاکٹر محمد۔ غالب اور اثرِ غالب، ص ۲۰۳

۱۵۷۔ حامد حسن قادری، ڈاکٹر۔ غالب کی اُردو نثر اور بعض دوسرے مضامین۔ (کراچی: ادارہ یادگارِ غالب، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۷

۱۵۸۔ ایضاً، ص ۸۱

۱۵۹۔ سرور، پروفیسر آل احمد۔ نئے اور پرانے چراغ۔ (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۱ء)، ص ۱۲۷
۱۶۰۔ ضیاء القادری، محمد یعقوب۔ اکمل التاریخ (حصہ اوّل)، (بدایون: مطبع قادری، ۱۹۱۶ء)، ص ۶۶
۱۶۱۔ دیوانِ غالب اُردو (نسخہ عرشی)، ص ۲۲۲
۱۶۲۔ شرر، مولوی علی بخش۔ برق خاطف۔ (آگرہ: مطبع اسعد الاخبار، ۱۲۶۹ھ)، ص ۱۷۹
۱۶۳۔ سرور، پروفیسر آل احمد۔ نئے اور پرانے چراغ، ص ۱۲۶
۱۶۴۔ رسوا، احمد حسن۔ دیوانِ رسوا۔ (لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۹۸ء)
۱۶۵۔ غالب، اسد اللہ خان۔ دیوانِ غالب (نسخہ طاہر)، گوہر نوشاہی، مرتب؛ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۵۷
۱۶۶۔ رضا، احمد رضا خان۔ حدائق بخشش (حصہ اوّل)۔ (کراچی: از ہر بک ڈپو، سن ندارد)، ص ۶۷
۱۶۷۔ بحوالہ: صحیفہ۔ حصہ اوّل، غالب نمبر، (لاہور: شمارہ نمبر ۴۶، جنوری ۱۹۶۹ء)، ص ۶۸
۱۶۸۔ ایضاً، ص ۶۹ تا ۷۱
۱۶۹۔ عزیز بیگ، مرزا سہارن پوری۔ روحِ کلامِ غالب۔ (بدایون: مطبع نظامی، ۱۹۳۵ء)، ص ۱۲۱، ۱۲۲
۱۷۰۔ ایضاً، ص ۲۱۱ ۱۷۱۔ ایضاً، ص ۲۱۱
۱۷۲۔ مجروح، میر مہدی حسین۔ مظہر معانی۔ (لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۹۹ء)، ص ۱۸۷
۱۷۳۔ عزیز بیگ، مرزا سہارن پوری۔ روحِ کلامِ غالب، ص ۵۷
۱۷۴۔ صبا اکبر آبادی، تضمین کلامِ غالب۔ (غیر مطبوعہ) ص ۲۰۶
۱۷۵۔ حامد حسن قادری، ڈاکٹر۔ غالب کی اُردو نثر اور بعض دوسرے مضامین، ص ۱۰۹
۱۷۶۔ حالی، مولانا الطاف حسین۔ یادگارِ غالب، ص ۹۰
۱۷۷۔ بحوالہ: ایوب قادری، ڈاکٹر محمد۔ غالب اور عصرِ غالب، ص ۲۳۹
۱۷۸۔ منیر شکوہ آبادی، اسماعیل حسین۔ نظم منیر۔ (رام پور: مطبع سعیدی، سن ندارد)، ص ۵۱۷
۱۷۹۔ سحر بدایونی، دیپی پرشاد۔ سحر سامری۔ (کان پور: مطبع نول کشور، ۱۸۹۴ء)، ص ۱۱۱
۱۸۰۔ حسن بریلوی، مفتی محمد۔ چمنستانِ سخن۔ (گورکھپور: مطبع رفاہِ عام، ۱۹۰۸ء)، ص ۲۱
۱۸۱۔ بحوالہ، آغا احمد علی۔ ہفت آسمان۔ (کلکتہ: ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۸۷۳ء)، ص ۶۶
۱۸۲۔ آل محمد مارہروی، سید۔ دیوانِ تواریخ۔ (آرہ: مطبع نور الانوار، ۱۲۸۸ھ)، ص ۸۷
۱۸۳۔ گیان چند، ڈاکٹر۔ رموزِ غالب، ص ۳۸۱